ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

جلد ۱۷۔ شمارہ ۶۔ جون ۲۰۰۶ء

"کشمیر کے حل کو ایک واقعے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ارتقائی عمل کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ جب تک اس مسئلے کو بھارت اور پاکستان کی باہمی مخاصمت میں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کا ایک ذریعہ (Bargaining Issue) سمجھا جاتا رہے گا، یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا۔ کوئی بھی پیش رفت تبھی ممکن ہوگی جب اسے ایک مشترک مسئلہ سمجھا جائے جس کا حل فریقین کو مطلوب ہو۔"

[آرا وافکار]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام، جمہوریت اور پاکستانی سیاست

میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو صاحب کے درمیان طے پانے والا ''میثاق جمہوریت'' اس وقت نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی حلقوں میں زیر بحث ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلووں پر مسلسل اظہار خیال کیا جا رہا ہے، توقعات کا اظہار بھی ہو رہا ہے اور خدشات کا تذکرہ بھی جاری ہے۔

میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو دو دفعہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ ہر بار ایسا ہوا ہے کہ ایک نے دوسرے کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کیا ہے اور اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں، جس کا بڑا حصہ فوج ہے، اپنے حریف کی اقتدار سے محرومی پر خوشی منائی ہے۔ ہر بار ایسا ہوا ہے کہ اپوزیشن نے یہ طے کر لیا ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کو اپنی مدت پوری کرنے کا موقع نہیں دینا اور ایسے حالات ہر حال میں پیدا کرنے ہیں کہ فوج مداخلت پر آمادہ ہو اور براہ راست یا بالواسطہ دخل دے کر اسے اقتدار سے محروم کر دے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف کے چاروں ادوار حکومت میں یہی کھیل کھیلا گیا ہے اور دونوں محترم لیڈر دو دو بار وزیر اعظم بننے کے باوجود اپنی ٹرم پوری نہیں کر پائے۔ اس مکروہ کھیل کا نتیجہ آج نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ عالم اسلام بھگت رہا ہے اور ہمارے پاس اپنے زخم چاٹنے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان وجود میں آیا تھا تو بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اسلام اور جمہوریت کو پاکستان کی بنیاد قرار دیا تھا اور اس عزم اور وعدے کے ساتھ قیام پاکستان کی جدوجہد کو منزل مقصود تک پہنچایا تھا کہ پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی جو اسلامی اصولوں کے دائرے میں کام کرے گی اور نئے دور میں دنیا کو اسلامی اصولوں کے تحت ایک جمہوری ریاست اور فلاحی معاشرے کا عملی نمونہ دکھائے گی، لیکن قیام پاکستان کے بعد سے اب تک اسلام اور جمہوریت دونوں کے ساتھ مسلسل گلی ڈنڈا کھیلا جا رہا ہے اور یہ دونوں سنہری اصول ہمارے مقتدر حلقوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش میں سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ مولوی لوگ جمہوریت پر صاد نہیں کریں گے اور مسٹر لوگوں کو مولوی کا پیش کردہ اسلام قبول نہیں ہوگا، اس لیے یہ نوزائیدہ ریاست پہلے مرحلے میں خدانخواستہ ناکامی کا شکار ہو سکتی ہے، لیکن بحمد اللہ

ایسا نہیں ہوا۔ مولوی لوگوں نے قرآن وسنت کی پاسداری کی شرط پر جمہوریت کو حکومت کی بنیاد تسلیم کر لیا اور مسٹر لوگوں نے جمہوریت کی پاسداری کی شرط پر اسلام کی بالادستی پر صاد کر دیا جس کی دستاویزی شہادت قرارداد مقاصد، تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علمائے کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات اور ۱۹۷۳ کے دستور پر سب کے اتفاق کی صورت میں موجود ہے جن کے ذریعے یہ بات طے پا گئی کہ حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے، لیکن وہ مملکت کی پالیسیوں کے تعین میں قرآن وسنت کے احکام کے پابند ہوں گے۔ اس طرح جس بڑی کشمکش کا خطرہ تھا، وہ ہمیشہ کے لیے ٹل گئی، لیکن اس کی جگہ پاور پالیٹکس نے لے لی اور اقتدار کے سرچشمہ پر کنٹرول کی ہوس نے اسلام اور جمہوریت دونوں کو گزشتہ نصف صدی سے اس ملک میں سوالیہ نشان بنا رکھا ہے۔

ہم نے اسلام اور جمہوریت کے لیے اس سے قبل بھی بہت اعلانات کیے ہیں، بڑے وعدے کیے ہیں، قوم کو بڑے سبز باغ دکھائے ہیں، ہم نے قرارداد مقاصد کی صورت میں قوم سے وعدہ کیا، ہر دستور میں اسلام اور جمہوریت کی پاسداری کا عہد کیا، ہر الیکشن کے موقع پر ہر سیاسی پارٹی نے اپنے اپنے انتخابی منشور میں ان دو سنہری اصولوں کو اپنا نصب العین قرار دیا اور سب سے بڑھ کر ۷۳ کے دستور میں ہم نے اسلام، جمہوریت، وفاقیت، فلاحی ریاست اور رفاہی پاکستان کے تقاضوں کو خوب صورت انداز میں سمویا۔ ۷۳ کے دستور میں کون سی بات نہیں ہے؟ اور اسلام، جمہوریت، صوبائی خودمختاری اور فلاحی ریاست کے تقاضوں میں ہم آہنگی اور توازن کا کون سا پہلو تشنہ ہے؟ لیکن اس دستور کا ہم نے اپنے ہاتھوں جو حشر کیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ یہ دستور ہمیں سیدھے راستے پر چلانے کے بجائے اپنے وجود اور بقا کے حوالے سے ہمارے رحم وکرم پر ہے۔ ہم ملک کے اقتدار پر مکمل کنٹرول کرنے کے بعد اس دستور کو باقی رہنے دیتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے اس غریب کی رحم کی اپیل منظور کر لی ہے اور اسے مزید کچھ دیر زندہ رہنے کا حق دے دیا ہے، خواہ اسے کئی سال ''کومے'' میں ہی گزارنا پڑیں۔

ہمیں محترم میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے ''میثاق جمہوریت'' کے مندرجات سے اختلاف نہیں ہے۔ ہم ان کے جذبے کی قدر کرتے ہیں کہ بدیر سہی، لیکن انھیں جمہوریت کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری کا خیال تو آیا، انھیں احساس تو ہوا کہ جمہوریت صرف اقتدار کے حصول کے لیے سیڑھی یا اس کے تحفظ کے لیے بیساکھی کا نام نہیں ہے، بلکہ اپنے کچھ اصول رکھتی ہے، اس کے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں، اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، کچھ لوازمات ہوتے ہیں اور وہ آگے بڑھنے کے لیے سیاست دانوں سے ایک مخصوص ماحول اور کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ہم دونوں لیڈروں کے اس ادراک اور احساس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسے خوش آمدید کہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان اصولوں پر پہلے کبھی اختلاف رہا ہے؟ کیا ان دونوں پارٹیوں کے انتخابی منشوروں اور ۷۳ کے دستور میں یہ باتیں شامل نہیں ہیں؟ اگر یہ سب کچھ پہلے سے موجود ہے اور ان کے ساتھ کمٹ منٹ کا پہلے بھی کئی بار اظہار ہو چکا ہے تو انھیں ایک نئے میثاق کی شکل دینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟

اصل بات اصولوں، میثاقوں اور الفاظ کی نہیں بلکہ طرز عمل کی ہے، سیاسی مزاج کی ہے اور مستقبل کے عزائم کی ہے۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہے تو یہ ''میثاق جمہوریت'' ۷۳ کے دستور سے زیادہ مقدس دستاویز نہیں ہے۔ حالات کی ناہمواری انسان کو ایک رخ پر لے آتی ہے، وہ رخ کبھی مستقل نہیں ہوتا اور اصل صورت حال کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب حالات نارمل ہوتے ہیں اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ ناہموار حالات میں ایک رخ اختیار کرنے والوں کا اصل رخ کیا ہے؟ مزاج اور جبلت کبھی نہیں تبدیل ہوتے۔ اس پر ایک کہاوت کا حوالہ دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ کسی بادشاہ کا اپنے وزیر کے ساتھ اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ فطرت تبدیل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بادشاہ کا موقف تھا کہ تربیت اور ماحول کے ساتھ فطرت تبدیل ہو جاتی ہے مگر وزیر اس سے متفق نہیں تھا اور وہ بضد تھا کہ فطرت کسی حالت میں نہیں بدلتی۔ بادشاہ نے وزیر کو قائل کرنے کے لیے چند بلیاں پالیں، انھیں اس طرح تربیت دلوائی کہ وہ بڑے ادب اور ترتیب کے ساتھ اگلے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں اٹھائے دو پاؤں پر چلتی ہوئی دربار میں آتیں اور بادشاہ کے گرد گھیرا ڈال کر باادب کھڑی ہو جاتیں۔ وزیر کو یہ منظر دکھا کر بادشاہ نے وزیر سے دریافت کیا کہ کیا خیال ہے، فطرت تبدیل ہوتی ہے یا نہیں؟ وزیر نے کہا کہ بادشاہ سلامت! اس کا جواب کل دوں گا۔ دوسرے روز وزیر چند چوہے آستین میں چھپا کر دربار میں لے آیا اور جونہی بلیاں اپنی ٹریننگ کے مطابق باادب چلتے ہوئے بادشاہ کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہوئیں، وزیر نے چپکے سے چوہوں کو دربار میں کھلا چھوڑ دیا۔ بلیوں نے چوہوں کو دوڑتے دیکھا تو جلتی ہوئی شمعیں وہیں پھینکیں اور چوہوں کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ شمعیں قالینوں پر گرنے سے بہت سی جگہوں سے قالین جل گئے اور آگ کو پھیلنے سے بڑی مشکل سے روکا گیا۔ وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ حضور! یہ بلیوں کی اصل فطرت ہے اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

اس لیے اس ''میثاق جمہوریت'' کی اصلیت اس وقت سامنے آئے گی جب دونوں لیڈر ملک میں ہوں گے (خدا کرے کہ وہ جلدی آ جائیں)، اقتدار کا چوہا ان کے سامنے ہوگا اور دونوں کی یکساں دسترس میں ہوگا۔ تب پتہ چلے گا کہ ''میثاق جمہوریت'' کا کون سا جملہ ان میں سے کس کو یاد رہ گیا ہے اور کون سا لندن اور دوبئی کی فضاؤں میں تحلیل ہو چکا ہے۔ ویسے ہمارے خیال میں اتنے لمبے چوڑے ''میثاق جمہوریت'' کے تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر دونوں لیڈر صرف اتنا اعلان کر دیتے کہ دونوں دستور کی پاسداری کریں گے، ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں گے، ایک دوسرے کا احترام کریں گے، ایک دوسرے کو جمہوری اصولوں کے مطابق آگے آنے کا موقع دیں گے اور اقتدار میں آنے کی صورت میں ٹرم پوری ہونے تک اس کے لیے مشکلات کھڑی نہیں کریں گے تو یہ چند جملے شاید بھاری بھرکم میثاق جمہوریت سے زیادہ وزنی ثابت ہوتے۔

ہمایوں خان☆

مسئلہ کشمیر: تازہ صورت حال اور کشمیری رائے عامہ

۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں، جب میں بھارت میں پاکستان کا سفیر تھا، میرے لیے جموں اور کشمیر جانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ دہلی یا اسلام آباد میں سے کوئی بھی اس کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تقریباً ۲۰ سال کے بعد مجھے واہگہ سے جموں تک زمینی اور وہاں سے سری نگر تک فضائی سفر کا موقع ملا، اور کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ بھارت اور پاکستان کے تعلقات درست سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

میرا یہ سفر دہلی کے مرکز برائے مکالمہ ومصالحت (Centre for Dialogue and Reconciliation) کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے سلسلے میں تھا جس میں لائن آف کنٹرول کے دونوں اطراف سے مختلف کشمیری گروپوں کو جمع کیا گیا تھا تاکہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں باہم گفت وشنید کریں۔ یہ سیمینار کشمیریوں کے مابین باہمی مکالمہ کے فروغ اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے مسلسل جاری کوششوں کا ایک حصہ تھا۔ ان کوششوں کا مقصد کشمیریوں کے مابین ایک واضح اتفاق رائے کو وجود میں لانا ہے تاکہ بھارت اور پاکستان کی طرف سے 'نیک دلی' کے ساتھ کشمیری عوام کی خواہشات کے احترام کے جو دعوے کیے جاتے ہیں، ان کی صداقت کو آزمایا جا سکے۔

کشمیر میں استصواب رائے کی تجویز کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی کشمیری عوام کی مرضی کیسے معلوم کی جائے؟ اب تک ساری توجہ وادی پر مرکوز رہی ہے جو کہ سابقہ ریاست کا سب سے زیادہ گنجان آباد علاقہ ہونے کے باوجود کل علاقے کی آبادی کے صرف پانچویں حصے پر مشتمل ہے۔ پھر جموں اور لداخ، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کی کیا حیثیت ہے؟ ایک چھوٹے سے حصے پر توجہ مرکوز کرنا اور اسے خصوصی حیثیت دینا یقیناً ایک امتیازی رویہ ہے۔ سیمینار کے شرکا اس پر متفق تھے کہ کشمیری عوام کی امنگوں کو پورا کرنا مسئلہ کشمیر کے حتمی حل کا ایک ناگزیر عنصر ہے اور کشمیری عوام سے مراد سابقہ ریاست کے حدود میں بسنے والے تمام باشندے ہیں۔

اگلا سوال یہ تھا کہ بحیثیت مجموعی کشمیری عوام کی نمائندگی کا حق کس کے پاس ہے؟ اب تک مزاحمت کرنے والی کشمیری قیادت صرف وادی کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ آل پارٹیز حریت کانفرنس جیسی تنظیمیں اس مفہوم میں پورے کشمیر کی نمائندہ نہیں ہیں۔ مطلوبہ کشمیری قیادت کا تعین کیسے کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں مختلف تجویزیں پیش

☆ سابق سفیر، اسلامی جمہوریہ پاکستان۔

کی گئیں لیکن کسی پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔

اس بات کی ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ دوطرفہ مکالمہ میں تنوع کے حامل کشمیری نقطہ ہائے نظر کو بھی مستقل بنیاد پر شامل کیا جائے۔ اس ضمن میں موجودہ کشمیری قیادت اور بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین روز افزوں روابط کا خیر مقدم کیا گیا۔ شرکا نے دونوں ملکوں کے مابین جامع گفت وشنید کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت کی بھی ایک عمومی تائید کی۔

سیمینار کے شرکا کشمیری رائے عامہ کے ایک وسیع اور متنوع دائرے کی ترجمانی کر رہے تھے۔ یہ بات خوش کن تھی کہ بہت سے مسائل کے حوالے سے ان کے مابین اتفاق رائے موجود تھا۔ سب سے اہم نکتہ، جس پر زور دیا گیا، یہ تھا کہ تشدد کو ختم ہونا چاہیے، خواہ اس کا ارتکاب دہشت پسند عناصر کر رہے ہوں یا بھارتی سکیورٹی فورسز۔ یہ بات بھی محسوس کی گئی کہ اس بات کو موثر طور ثابت کرنا ابھی پاکستان کے ذمے ہے کہ وہ سرحد پار سرگرمیوں کو روکنے کے لیے فعال اقدامات کر رہا ہے۔ نیز بھارت کو نہ صرف سکیورٹی فورسز کی زیادتیوں کا سد باب کرنا ہے، بلکہ ان کے ہاتھوں معصوم عوام کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی بھی کرنی ہے۔ شرکا کا عمومی مطالبہ یہ تھا کہ بھارت کو غیر فوجی علاقوں سے پولیس کے علاوہ تمام مسلح افواج کو نکال لینا چاہیے۔

اتفاق رائے کا دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ ریاست کو ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کے نقشے کے مطابق دوبارہ متحد کر دیا جائے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا کہ بھارت اور پاکستان کی ضمانت کے تحت ایک خود مختار کشمیر قائم ہو جائے، تاہم عملیت پسندانہ رائے یہ تھی کہ یہ صورت دونوں ملکوں میں سے کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس کے بعد بہترین متبادل صورت یہ تھی کہ زمینی صورت حال کے لحاظ سے کشمیر کے تمام علاقوں کو اس طرح یکساں بنا دیا جائے کہ اس کے اثرات کشمیریوں کے طرز زندگی پر مرتب ہوں۔ اس مقصد کے لیے ہر قسم کی پابندیوں کو ختم کرتے ہوئے لوگوں کو حق دیا جائے کہ کشمیر کے کسی بھی حصے میں سفر کر سکیں، آزادانہ تجارت اور اشیا کے نقل وحمل کی اجازت دی جائے، رسمی نوعیت کی انتظامی کارروائیوں کو سادہ بنا دیا جائے تا کہ ریاست کا شہری ہونے کی بنیاد پر شناختی کارڈ کے حامل ہر شخص کو لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب سفر اور تجارت کرنے کی آزادی ہو، اور دونوں حصوں کے مابین تمام روایتی سڑکیں بحال کر دی جائیں۔ سیاحت کے فروغ کے لیے مشترکہ منصوبے بنانے کے سلسلے میں لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب کے باشندوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور انھیں سہولیات فراہم کی جائیں، نیز جنگلات، پانی کے استعمال، بجلی کی پیداوار، ماحولیاتی مسائل اور اس نوعیت کے دیگر امور سے متعلق ریاست کی سطح پر ایک مشاورتی نظم قائم کر دیا جائے۔

اگر بھارت اور پاکستان کے مابین جامع گفت وشنید کے عمل کو پوری قوت سے آگے بڑھایا جائے اور دونوں اطراف میں باہمی تعاون کی فضا موجود ہو تو مذکورہ تمام تجاویز قابل عمل ثابت ہوں گی۔ معروضی طور پر دیکھا جائے تو سیمینار میں پیش کردہ تجاویز میں سے کوئی بھی ناقابل عمل نہیں ہے۔ بھارت اور پاکستان، دونوں لائن آف کنٹرول کی موجودہ حیثیت کو عملاً ختم کرنے کا علانیہ عزم رکھتے ہیں۔ اگر یہ عزم حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے تو دہشت پسندی اپنا جواز کھو دے گی۔ اس وقت کشمیر میں قریب قریب غصے کی سی کیفیت پائی جاتی ہے، کیونکہ کشمیری عوام کو بے حد دکھوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ متاثرہ علاقوں میں مشکل ہی سے کوئی ایسا خاندان ملے گا جو دہشت پسندوں یا سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں اپنے

کسی عزیز یا گھر بار سے محروم نہ ہو چکا ہو۔ پاکستان میں شامل ہونے کی خواہش یا اشتیاق کا کوئی اظہار نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح بھارت کے حوالے سے بھی اجنبیت اور دوری کا ایک گہرا احساس موجود ہے۔

کشمیریوں کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ امن وامان اور معمول کی صورت حال کا ایک طویل عرصہ ہے جو بیرونی مداخلت سے پاک ہو۔ اگر یہ میسر ہو جائے اور اس کے ساتھ بامعنی اقتصادی ترقی شامل ہو جائے تو دکھوں کے مداوا کا عمل شروع ہو سکتا ہے۔ اس سے کشمیریوں کو ٹھنڈے دل ودماغ اور سکون کے ساتھ آپس میں گفت وشنید کرنے اور اس کے نتیجے میں شاید واضح اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کرنے کا موقع ملے گا کہ آخر کار وہ کیا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ بھی احساس ہوگا کہ انھیں بعض عملی حقیقتوں کو ملحوظ رکھنا ہے اور اگر ان میں جبر کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ انھیں گوارا بھی کر لیں۔

اس ساری گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کشمیر کے حل کو ایک واقعے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ارتقائی عمل کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ جب تک اس مسئلے کو بھارت اور پاکستان کی باہمی مخاصمت میں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کا ایک ذریعہ (Bargaining Issue) سمجھا جاتا رہے گا، یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا۔ کوئی بھی پیش رفت تبھی ممکن ہوگی جب اسے ایک مشترک مسئلہ سمجھا جائے جس کا حل فریقین کو مطلوب ہو۔ اس ضمن میں پہلے قدم کے طور پر اس سے بہتر کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ کشمیری عوام فوری طور پر جن خواہشات کا اظہار کر رہے ہیں، ان کا احترام کیا جائے۔ بات کو نئے رخ پر آگے بڑھانے کے لیے ڈاکٹر من موہن سنگھ کا متوقع دورۂ پاکستان ایک اچھا موقع ہوگا۔

(بشکریہ 'ڈان'۔ ترجمہ: ابوطلال)

محمد سمیع اللہ فراز☆

اسلامی تحریکیں اور مغربی تحقیقات

موجودہ دور کو بجا طور پر مغربی فلسفہ وفکر اور علوم وفنون کی بالا دستی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار ونظریات اور انسان وکائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا آج سے تقریباً دوسو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو، فکر اور سوچ کے دائرے میں ایک ہی طرز فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے۔ بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر، ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدن کا سکہ پوری دنیا میں جاری ہے۔ مغربی تہذیب وتمدن اور فلسفہ کا یہ تسلط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بسا اوقات یوں دکھائی دیتا ہے کہ خود جدید مسلم فکر اور اسلامی تحریکات بھی، جو اصلاً مغربی فکر کے استیلا کے مقابلے کے لیے وجود میں آئیں، مغرب کے فکری اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

گزشتہ صدی میں عموماً اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط (۱۹۲۴ء) کے بعد خصوصاً، مغرب کا یہ استیلا نہ صرف سیاسی وعسکری بلکہ ذہنی وفکری دائروں میں بھی عالم اسلام پر قائم ہوا، تاہم مسلم دنیا پر مغرب کی یورش چونکہ اصلاً سیاسی تھی، اس لیے عالمِ اسلام میں اس کے خلاف پیدا ہونے والے ردعمل میں بھی اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بقول ملتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہِ راست تسلط اور قبضے اور کہیں انتداب وتحفظ کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، بارہا دردانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی عمرِ رفتہ اور عظمت وسطوتِ گزشتہ کی بازیافت کی شدید تمنا اور گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی جمال الدین افغانی کی انقلاب پسند شخصیت کا روپ دھارا اور کبھی تحریکِ خلافت کی صورت اختیار کی، لیکن حقائق نے ہر بار جذبات وخواہشات کا منہ چڑایا اور مغرب کی سیاسی بالا دستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

مغربی فلسفہ وفکر اور تہذیب وتمدن کے مقابلے میں عالم اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں ہونا بھی ناگزیر تھا۔ اسی احساسِ تحفظ نے 'احیائے اسلام'، 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور 'نفاذِ نظامِ اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ملکوں میں منظّم کیں،

☆ لیکچرار شعبہ علومِ اسلامیہ ورچوئل یونیورسٹی آف پاکستان۔ samiullahfraz@hotmail.com

جن میں کچھ اصلاحی طریقہ کار پر گامزن ہو کر پرامن ماحول میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہیں اور کچھ تحریکوں نے شدت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے مغرب کی ہر پالیسی کا نہ صرف انکار کیا بلکہ منظم گروہوں کی شکل میں مغربی یورش کے مقابلہ ومزاحمت کی کوشش بھی کی۔ تحفظ ومدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جن میں محض تحفظ پر قناعت کی گئی اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر وانکسار کی روش اختیار کی گئی۔

مغربی مفکرین ومستشرقین نے اسلامی تحریکات کے مزاج کا گہرا فہم حاصل کرنے اور ان کے بارے میں اپنے لائحۂ عمل کو ترتیب دینے کے لیے ان کو اپنے خصوصی مطالعہ کا موضوع بنایا اور دونوں قسم کی تحریکوں کی طبقہ بندی کر کے اس کے موافق پالیسیاں تشکیل دیں۔

اسلامی تحریکات کے حوالے سے مستشرقین میں تین طرز فکر پائے جاتے ہیں۔ اول، وہ جنھوں نے اسلامی تحریکات کو انتہا پسند اور ریڈیکل قرار دیتے ہوئے اُن پر تنقید کی ہے اور مغربی پالیسی سازوں کو ان کے خلاف اقدامات کی سفارشات کی ہیں۔ دوسرے، وہ طبقہ جس نے اسلامی تحریکوں اور گروپوں کے بارے میں مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے ان کی خدمات اور اسلامی معاشروں پر ان کے اثرات کو تسلیم کیا ہے۔ تیسرا وہ طبقہ جس نے معتدل انداز میں اسلامی تحریکات اور شدت پسند گروہوں کے نقصانات اور ان کے ممکنہ خطرات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فوائد، مجبوریوں اور ان کے پس منظر میں کارفرما عوامل کا بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی مغربی حکومتوں کو یہ تجویز دی ہے کہ ان کے تحفظات کو دور کیا جائے تاکہ امنِ عالم کے قیام میں حائل رکاوٹوں کا تدارک ہو سکے۔

اسلامی تحریکات کے بارے میں استشراقی افکار کا جائزہ اس تحقیقی ورثہ کی روشنی میں لیا جا سکتا ہے جس میں تاریخِ اسلامی، اسلامی سیاست اور معاشرت پر بحث کی گئی ہے اور اسی ضمن میں اسلامی تحریکات کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ مشہور مستشرق John L. Esposito نے اپنی متعدد تصانیف مثلاً *The Islamic Threat: Myth or Reality* (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 1999ء) میں اسلامی تحریکات کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے مغرب کو ان کے عزائم سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی مصنف کی ایک دوسری کتاب *World Religions Today* (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2002ء) میں بھی انھی خیالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ Esposito کی تصنیف *Unholy War: Terror in the name of Islam* (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2002ء) میں بھی اسلامی مکاتبِ فکر اور تحریکات سے متعلق استشراقی مفروضات وخدشات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ 2002ء ہی میں شائع ہونے والی ان کی کتاب *What Everyone Needs to Know about Islam* میں بھی اسلامی تحریکات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ Esposito کی ایسی ہی ایک اور تصنیف *Makers of Contemporaty Isalm* ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام 2001ء میں شائع ہوئی ہے۔

Bernard Lewis طبقۂ استشراق میں اعلیٰ پایہ کے محقق شمار ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ ان کا مستقل موضوع ہے جس کے تحت انہوں نے مختلف خطوں میں قائم اسلامی ریاستوں کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو ایک تحریک کا نام دیا ہے۔ ان کی تصنیف *The Emergence of Modern Turkey* (آکسفورڈ پریس، 2002ء) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسی طرح ان کی تصنیفات *Crises of Islam: The Holy War and*

Unholy Terror اور *The Arabs in History* بھی قابلِ ذکر ہیں۔

امریکی مفکر Shireen T. Hunts کی کتاب *The Future of Islam and The West* کو The Center for Strategic and International Studies نے امریکہ سے شائع کیا جس میں موجودہ اسلامی تحریکوں کی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔

بعض مغربی مفکرین نے اسلامی تحریکات کو اسلامی مذہب کا المیہ قرار دیا ہے جن کے باعث اسلام کا امیج مغرب میں قابلِ قبول نہیں رہا۔ ایسی ہی ایک تصنیف Ernest Gellner کی *Islamic Dilemmas: Reforms, Nationalists and Industrialists* ہے جو برلن، جرمنی سے Walter de Gruyter کے زیر اہتمام 1985ء میں شائع ہوئی۔

چند مستشرقین کے ہاں خالصتاً اسلامی تحریکات پر بھی تصانیف ملتی ہیں، مثلاً: Shaul Mishal اور Avraham Sela کی متفقہ کاوش *The Palestinian Hamas* (Columbia University Press New York, 2000ء) میں فلسطینی شدت پسند تنظیم 'حماس' کے پس منظر اور مقاصد پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح بعض تصانیف قومیتوں اور اسلامی ریاستوں کو بنیاد بنا کر لکھی گئیں اور ان میں سرگرم اسلامی تحریکات کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے جیسا کہ *Arab Awakening and Islamic Revival* (Transaction Publishers, New Jersey, 1996) میں اس کے مصنف Martin Kramer نے مشرقِ وسطیٰ میں پائے جانے والے سیاسی افکار کا جائزہ پیش کرتے ہوئے مغرب سے اِن تحریکوں اور قومیتوں کے تحفظات کو دور کرنے کی درخواست کی ہے۔ ایسی ہی ایک تحقیق Raywond Hirnnebusch اور Anoushiravan Ehtishami نے مشترکہ طور پر *The Foriegn Policies of Middle East States* کے نام سے کی ہے جس کو Lymme Rienner Publishers Colorado, USA نے 2002ء میں شائع کیا ہے۔ ایسی ہی ایک کاوش *The Middle East and Islamic World Reorder* کے نام سے Morvin E. Gettleman اور Stuart Schear نے کی ہے جس کو Grove Press, 841 Broadway New York نے 2003ء میں شائع کیا۔

ازمنہ وسطیٰ میں اسلامی تحریکات اور ان کے کردار سے متعلق R. Stephen Humphreys نے اپنی تصنیف The Middle Age in a Trouble Age, Between Memory and Desire (یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس لندن، 1999ء) میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

اسلامی مکاتب فکر اور تحریکات کے بارے میں جدید استشراقی رجحانات کو سمجھنے کے لیے S.N.Eisenstadl کی کتاب *Fundamentalism, Sectarianism and Revolutions* (کیمبرج یونیورسٹی پریس برطانیہ، 1999ء) ایک سنگِ میل ہے۔ اسی طرح Mark Juergensmeyer کی کتاب *Terror in the Mind of God* (یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، لندن 2003ء) میں استشراقی سوچ واضح ہوتی ہے۔ Shaul Shay نے *The Redsea Terror Triangle* (The Interdisciplinary Centre, USA, 2005) میں سوڈان، صومالیہ اور یمن کی مثلث کے علاوہ دیگر خطوں

میں اسلامی وجہادی گروپوں کے بارے میں بحث کی ہے۔ Dore Gold نے Hat Red's Kingdom (Renery Publishing Inc. Washington DC, 2003) میں عالمی دہشت گردی کا ذمہ دار سعودی حکومت کو ٹھہرایا ہے۔ Sidney Tarrow کی کتاب *Power in Movement* کے نام سے (کیمبرج یونیورسٹی پریس یو کے، 1998ء) میں اسلامی تحریکات کی جدوجہد کا جائزہ لیا گیا اور ان کی قوت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی ریاستوں میں اسلامی تحریکات کے کردار کے بارے میں Arye Oded کی کتاب *Islam & Politics in Kenya*(Lynne Rienner Publishers Inc. USA, 2000) کا مقدمہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس ضمن میں Hugh Roberts کی کتاب *The Battlefield Algeria (1988-2002)* جو 6-Meard Streat London سے 2003ء میں شائع ہوئی)، Ceasar E. Farah کی *ISLAM* جو Barran's Educational Sciences Inc. NY نے 2003ء میں شائع کی، Fereydoun Hoveyda کی *The Broken Cresent* ,Praeger Publishers*(* USA, 1998) اور *Encyclopedia of Terrorism* شائع شدہ Sage Publishers Inc. USA, 2003 بھی نہایت اہم اضافے ہیں جن سے استشراقی فکر کا اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے۔

مکالمہ بین المذاہب کے حامی مستشرقین نے بھی اپنی تحریرات میں اسلامی تحریکات کے کردار کا ذکر کیا ہے اور اسلامی مملکتوں کو ان کی اصلاح کی تجاویز دیتے ہوئے اس بات کی امید ظاہر کی ہے کہ اس کے بعد بین المذاہب مکالمہ میں حائل رکاوٹیں کم ہوسکتی ہیں۔ دی اسلامک فاؤنڈیشن امریکہ نے 1998ء میں ایسی ہی ایک رپورٹ *Christian Mission and Islamic Dawah* کے نام سے شائع کی۔

Karen Armstrong کا شمار مستشرقین کے اعتدال پسند طبقہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو قریب سے دیکھا اور پھر اس کی حقانیت کا اقرار اپنی تحریرات میں بجا طور پر کیا ہے۔ انہوں نے *Muhammad: A Western Attempt to Understand Islam* میں بھی اسلامی تحریکات کی خصوصیات ذکر کی ہیں۔ یہ کتاب Victor Gollancz نے 1992ء میں لندن سے شائع کی۔ انہی اعتدال پسند مستشرقین میں سے Cragg Kenneth کی *Call of Minaret* ہے جس کو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے نیویارک سے 1956ء میں شائع کیا تھا۔ اسی طبقہ سے Morman Daniel بھی ہے جس کی تصانیف *Islam and the West: The Making of an Image* اور *The Arabs and the Medieval Europe* بالترتیب آکسفورڈ سے 1960ء اور Longman London سے 1979ء میں شائع ہوئیں۔

Albert Hourani نے بھی اسلامی تحریکات وسیاست کا جائزہ لیا ہے۔ اس کی ایک تصنیف *Europe and Middle East* کے عنوان سے لندن سے 1980ء میں شائع ہوئی۔ اس کی دوسری تصنیف *Western Attitudes towards Islam* یونیورسٹی آف ساؤتھ ایمپٹن سے 1974ء میں شائع ہوئی۔ Hourani کی کتاب *Islam in European Thought* بھی مغربی فکر کا اندازہ لگانے میں مددگار ہے۔ مؤخر الذکر کو کیمبرج یونیورسٹی پریس نے 1989ء میں شائع کیا۔

1957ء میں Princeton University Press نے Wilfred Smith کی کتاب *Islamic Movements in Modern History* طبع کی۔ 1962ء میں ہارورڈ یونیورسٹی پریس نے R.W.Southern کی *Western Views of Islam in Middle Ages* شائع کی۔ اسی طرح مشہور مستشرق Montgomery Watt کی تصنیف *Islamic Fundamentalism and Modernity* میں بھی، جو لندن سے Ken Paul نے 1988ء میں شائع کی، اسلامی تحریکات کو بنیاد پرست اور دہشت گرد کہا گیا ہے۔ ایسے ہی خدشات وتحفظات کا اظہار اس نے اپنی کتاب *Ultimate Vision and Ultimate Truth* میں کیا ہے جس کو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے 1995ء میں شائع کیا۔

اسلامی انقلاب کے خطرے پر لکھی گئی تصانیف میں Quintan Wiktorowicz کی *Islamic Activisim: A Social Movement Theory Approach* (شائع کردہ Indiana University Press, 2004ء)، Will Wagner کی *How Islam Palns to Change the World* (شائع کردہ Kregel Publications, USA 2004)، Zachary Abuza کی تصنیف *Militant Islam in Southeast Asia* (شائع کردہ Lynne Rienner Publishers USA 2003)، Barry Rubin کی *Revolutioneries and Reforms: Contemporary Isalmist Movements in the Middle East* (شائع کردہ State University of New York Press USA, 2003)، Yoram Schweitzer اور Shaul Shay کی مشترکہ تحقیق *The Globalization of Terror* (شائع کردہ The interdisciplinary Center USA) اور Max.Taylor اور John Horgan کی مشترکہ تحقیق *The Future of Terrorism* (شائع کردہ Frank Cass Publishers London 2000) قابل ذکر ہیں۔

امتِ مسلمہ کی طبقاتی تقسیم بھی استشراق کا ایک اہم ہدف رہا ہے چنانچہ 2003ء میں Rand Corporation USA کی طرف سے 82 صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ میں مسلمانوں کو (۱) بنیاد پرست (۲) روایت پسند (۳) جدت پسند اور (۴) سیکولر طبقوں میں تقسیم کر کے ہر ایک طبقہ کی تنظیموں کے بارے میں ایک تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور ان کے حسبِ حال پالیسیاں ترتیب دینے کی سفارشات کی گئی ہیں۔ یہ رپورٹ *Civil Democratic Islam* کے نام سے شائع کی گئی ہے۔

اسلامی تحریکات ومکاتبِ فکر کے بارے میں قدیم وجدید استشراقی فکر ورجحانات کے دفاع میں مسلم محققین نے بھی اپنی تصانیف میں جزوی طور پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں سید حسین نصر نے اپنی کتاب ''جدید دنیا میں روایتی اسلام'' میں، جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے 1996ء میں اردو زبان میں شائع کی، روایتی اسلام اور اس کے احیا کے لیے مصروفِ عمل تحریکات ومکاتبِ فکر پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ تاہم یہ کتاب جدید استشراقی رجحانات کے پروان چڑھنے سے پہلے تصنیف کی گئی۔

Muhammad M. Hafeez کی تصنیف *Why Muslims Rebel?* قابل ذکر ہے جو

Lynne Rienner Publishers نے امریکہ سے 2004ء میں شائع کی۔ اسی طرح پروفیسر خورشید احمد کی کتاب *Islam and the West* میں بھی، جو اسلامک پبلی کیشنز لاہور نے 1979ء میں شائع کی، جزوی طور پر مغربی افکار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر غراب احمد عبدالحمید نے 'رؤیة اسلامیة للاستشراق' میں جس کو دارالاصالة للثقافة و النشر و الاعلام الریاض نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا، دین اسلام کے بارے میں استشراقی افکار پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر زقزوق محمود حمدی نے 'الاستشراق و الخلفیة الفکریة للصراع الحضاری' نامی تصنیف میں جدید مغربی استعمار اور دیگر تہذیبوں پر اس کے حملوں کے متعلق تفصیل بیان کی ہے۔ اس کتاب کو دارالمنار القاہرة مصر نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر اسماعیل سالم عبدالعال کی تصنیف 'المستشرقون و الاسلام' استشراقی افکار کو سمجھنے میں اہم ماخذ ہے جس کو رابطة العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر دیاب محمد احمد نے 'اضواء علی الاستشراق و المستشرقین' میں استشراقی اہداف و مقاصد کو مرکز بحث بناتے ہوئے ان کے اندازِ فکر پر کلام کیا ہے۔ اس کو دارالمنار قاہرة مصر نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔ زکریا ہاشم زکریا کی 'الاسلام و المستشرقون' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کو المجلس الاعلی للشؤن الاسلامیة مصر نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اسی سلسلہ میں حسب ذیل تصنیفات بھی اہمیت کی حامل ہیں:

ڈاکٹر مصطفی السباعی، 'الاستشراق و المستشرقون'، مکتبة دارالبیان، الکویت، س۔ن۔
شلبی عبدالجلیل، 'صورٌ استشراقیة'، مجمع البحوث الاسلامیہ، ۱۳۹۸ھ۔
المطعنی عبدالعظیم محمد الدکتور، 'افتراءات المستشرقین علی الاسلام'، المکتبة الوہبیة قاہرہ مصر، ۱۹۹۲ء۔
نجیب العقیقی، 'المستشرقون': دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۶۵ء۔

مغربی مفکرین نے اسلامی تحریکات کے لیے عموماً اور شدت پسند تنظیموں کے لیے خصوصاً ایک مخصوص رجحان کو ترقی دی کہ ایسی تحریکات انسانیت کی بقا کے لیے خطرہ ہیں لہٰذا ان کا سدّ باب ضروری ہے۔ انسانی کمزوریوں کو نظر انداز کر دینے کی یہی وہ خطرناک سوچ تھی جس سے نہ صرف مستشرقین بلکہ بعض جدت پسند مسلم مفکرین نے بھی ان تحریکات کے خلاف جانبدارانہ بلکہ متعصّبانہ رویہ اپنایا۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار کی گنجایش نہیں کہ ان تحریکات میں بھی بعض نے خلافِ مصلحت حد سے زیادہ شدت کا مظاہرہ کیا جس کے نتائج دیگر اصلاحی تحریکات کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کو بھی بھگتنا پڑے، تاہم ہمیں مغربی طرزِ فکر اور رجحان کو بھی انصاف پسندی کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ زاویہ نگاہ مزید ایسے رجحانات کو جنم دینے کا ذمہ دار ہے جو امنِ عالم کے لیے ہرگز موزوں نہیں۔ درحقیقت دوسری جنگِ عظیم اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات مغربی تسلط کی مخالف اسلامی تحریکات کے دوبارہ احیا کا باعث بنے۔

گزشتہ صفحات میں ذکر کی گئی کتب کے علاوہ اور بھی بہت سی استشراقی کتب سے اسلامی تحریکات و مکاتبِ فکر کے بارے میں مغربی طرزِ فکر واضح ہوتا ہے اور اسی طرزِ فکر کی روشنی میں مغربی ریاستوں کو مسلم ممالک کے متعلق پالیسیاں ترتیب دینے کی سفارشات کی جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے مسلم دانشور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے غفلت برت رہے ہیں جس سے

مغرب میں اسلام کا امیج بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے اور نتیجتاً مسلم ممالک پر مغربی یورش میں کمی آنے کی بجائے اضافہ ہو رہا ہے۔

دورِ حاضر میں مسلم امہ کا یہ المیہ ہے کہ وہ اپنی عظمتِ رفتہ کی بحالی اور نشاۃ کے لیے کسی مجموعی لائحہ عمل اور اجتماعی طرزِ فکر کو اختیار کرنے سے گریزاں ہے۔ اس کے برعکس مغرب ایک طرف اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مزید سے مزید برتری پیدا کرتا چلا جا رہا ہے اور دوسری طرف عالم اسلام کی تحریکوں اور مغرب کے فکری یا تہذیبی چیلنج کے مقابلہ کا پیغام کرنے والے گروہوں کے بارے میں متنوع اسالیب سے مصروفِ عمل ہے۔ ایسی صورتحال میں پہلے قدم کے طور پر مسلم امہ میں ذہنی وفکری بیداری کا پیدا ہونا ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ اولاً ہمیں ان فکری رجحانات ومیلانات کا جائزہ لینا ہوگا جو مغربی مفکرین ومستشرقین اسلامی دنیا اور اس کی تحریکات کے بارے میں اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں اور جن کی اصلاح ہونے کے بجائے ان میں مزید شدت آ رہی ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے نے اس میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اس کے بعد اسلام کو 'دہشت گرد اسلام' اور 'امن پسند اسلام' کے خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ثانیاً ان فکری رجحانات کا جائزہ لے کر مغرب میں اسلام کی درست صورت گری کی جائے تاکہ مغرب کے ساتھ افہام وتفہیم کا راستہ آسان تر ہو سکے جس کے نتیجہ میں گلوبلائزیشن کے عمل کو مثبت انداز میں تقویت پہنچے۔ مزید براں مسلم دانشوروں اور حکومتوں کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ اسلامی تحریکات کے کردار کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں اور ایک متفقہ لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے ان کے بارے میں غلط پروپیگنڈے کی تحقیقی انداز میں مذمت اور ان کے مثبت پہلوؤں اور تحفظات کو اجاگر کرنے کے بعد مغربی اندازِ فکر کو تبدیل کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

مغربی سوچ اور فکر کا جائزہ لے کر اس کے نقائص سے تحقیقی دنیا کو روشناس کرانا اور اس کے بعد مسلم تھنک ٹینکس کو درست سمت میں پالیسی سازی کے لیے راہنمائی فراہم کرنا محققین اور علما کی بھی ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد ہی اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ ہم اسلام کے بارے میں مغربی سوچ اور طرزِ فکر کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے اور اسلام کی حقیقی صورت گری ممکن ہو سکے گی۔ تبھی اس قابل ہوں گے کہ مغرب کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکیں اور یہی ہماری نشاۃ ثانیہ کا نقطۂ آغاز ہوگا۔ ان شاء اللہ

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی ☆

پاکستان میں اسلامی نظام کی جدوجہد

اور اس سے وابستہ اصولی اور اخلاقی تصوّرات

پاکستان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہ بنا اسلام کے نام پہ۔ پر پہلے دن سے وہاں اسلامی نظامِ حکومت کے لیے اس انداز کی جدوجہد چل رہی ہے جیسے حکمرانوں کے لیے یہ نظام ایک ناقابلِ قبول چیز ہو! ابتدائی دنوں کی سخت جدوجہد کے بعد اتنی کامیابی اس سلسلہ میں ملی کہ دستور ساز اسمبلی نے ''قراردادِ مقاصد'' نام کی ایک قرارداد پاس کردی۔ یہ گویا ملک کے لیے اسلامی دستور کا سنگِ بنیاد ہوا۔ مگر پھر دستور بننے میں وہ لوہے لگے کہ کہیں ۱۹۷۳ء میں جا کے یہ ہو سکا۔ یعنی پاکستان کے قیام پر ایک چوتھائی صدی گزرنے کے بعد۔ یہ دستور بہر حال ایسا بن گیا کہ جو طبقہ اسلامی نظامِ حکومت کی جدوجہد کر رہا تھا، اس نے بھی ضرورت کی حد تک اسے قابلِ قبول مان لیا۔ لیکن جتنی بھی حکومتیں اس دستور کے ماتحت بنیں، ان میں سے کسی کا بھی طرزِ حکومت اس طبقہ کے لیے اطمینان بخش نہیں رہا۔ اسلامی نظام (یا نظامِ مصطفٰے) کے نام پر آویزش کا ایک سلسلہ حکومتِ وقت کے ساتھ آج مزید ایک چوتھائی صدی گزر جانے پر بھی برابر قائم ہے۔ اور اس آویزش میں وہ نئے نئے طریقے برتنے کا تجربہ یہ اسلام پسند طبقہ کرتا نظر آرہا ہے کہ اس کے مقصد سے ہمدردی کے ساتھ یہ طریقے کسی طرح اس کے مقصد سے ہم آہنگ نہیں دکھائی دیتے۔ نظر ایسا آنے لگا ہے جیسے، کم از کم فی الحال، یہ لوگ اسلامی حکومت کے بارے میں اپنے اصل نظریہ کی کامیابی سے مایوس ہو چکے۔ اب مسئلہ کسی نہ کسی طرح بس برسرِ حکومت آجانے کا ہے۔ پس وقت ہے کہ اس اسلام پسند طبقہ کو معاملہ کے اس پہلو پر توجہ دلائی جائے۔

نیت نیک ہو سکتی ہے، اُس سے بحث نہیں۔ مگر ذرا غور کرنے کی بات ہے، جنرل مشرف نے نواز شریف کا تخت اُلٹا تو اس پورے اسلام پسند طبقہ کو اس پر نہایت خوش ہوتے دیکھا گیا۔ وقت بدل گیا اور جنرل مشرف سے بات بننے کے بعد بگڑ گئی اور بظاہر وہاں پہنچ گئی کہ اب پھر بننے والی نہیں، تو اس طبقہ کے نمائندے لندن میں انھیں نواز شریف صاحب سے یکجہتی کا اظہار کرنے پہنچ رہے ہیں۔ (معلوم ہے کہ شریف برادران آج کل لندن میں ان ارادوں کے اظہار کے ساتھ فروکش ہیں کہ وہ اب پاکستانی سیاست میں حصہ لینے کے لیے واپس آرہے ہیں۔) نواز شریف کا تخت اُلٹ جانے پر خوشی کا سب سے

☆ سرپرست ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ۔ حال مقیم لندن۔

اہم باعث، یا حوالہ، ان کی وہ مخالفِ اُسامہ وطالبان پالیسی تھی جو کارگل قصہ کے سلسلہ میں واشنگٹن سے واپسی پر بالکل ایک یو(U) ٹرن کے انداز میں موصوف نے اپنائی۔ اور پھر یہی پالیسی جب جنرل مشرف نے امریکہ کی معاونت میں ۲۰۰۱ء میں اپنالی تو اس طبقہ کے سب عناصر نے مل کر آنے والے الیکشن کے لیے ایک مشرف مخالف محاذ ''متحدہ مجلسِ عمل'' کے نام سے بنایا اور اسی (امریکہ دوست اُسامہ دشمن) پالیسی کے حوالہ سے ۲۰۰۲ء میں جنرل مشرف کی مسلم لیگ کے خلاف الیکشن لڑ کر کامیابی کا وہ درجہ حاصل کیا کہ دوسروں کو تو اس کا اندیشہ کیا، خود کو بھی اتنی امید نہ رہی ہوگی۔ پیپلز پارٹی تک پیچھے رہ گئی۔ لیکن اس کامیابی کے فوراً بعد کیا دیکھنے میں آیا؟ یہ کہ یہ کوشش شروع ہوئی کہ امریکہ اور مغربی ممالک اِن لوگوں کو اسامہ اور طالبان کی نظر سے نہ دیکھیں۔ محاذ کی قیادت نے جماعتِ اسلامی کے مرکز منصورہ میں ان ممالک کے سفرا کو اس مقصد کے لیے مدعو کیا۔ اس اجتماعِ سفرا کی جو رپورٹ اخبارات میں آئی، وہ سوائے اس کے کوئی دوسرا تأثر اس کے مقصد کے بارے میں نہیں دیتی تھی۔ تو کیا یہ ابن الوقتانہ (ان الفاظ کے لیے معذرت) طور طریقے ذرا ایک بھی بے نظیر اور نواز شریف جیسے خالص سیاسی لوگوں کے طور طریقوں سے مختلف ہیں؟ اور کیا ان خالص سیاسی لوگوں کے مقاصد کی راہ اور کاروانِ نظامِ مصطفےٰ کے مقصد کی راہ ایک بھی ہوسکتی ہے؟ اور اسی ایک راہ سے منزلیں دونوں کو الگ الگ بھی مل سکتی ہیں؟

اچھا تو پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا، اس میں ''اسلام کی حکومت'' قائم نہ ہو سکنے کا آخر وہ مسئلہ کیا ہے کہ اس حکومت کے علمبردار اپنی جدوجہد میں ہر ڈھنگ آزماتے آزماتے وہاں نکل گئے ہیں جہاں اس قافلہ کے ایک سالار کو غالب کا یہ شعر حسبِ حال نظر آنے لگ گیا تھا:

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اللہ جانے کیوں لوگوں کی نظر نہیں جاتی، یا جان کر انجان بنا جارہا ہے۔ بات تو بالکل سامنے کی ہے! اسلام کے نام پہ بے شک یہ ملک بنا تھا۔ مگر کون سا اسلام؟ مولانا محمد قاسم نانوتوی والا؟ مولانا مودودی والا؟ یا سرسید اور مسٹر محمد علی جناح والا اسلام؟ اگر یہ پہلے دو میں سے کسی کا ''اسلام'' ہوتا تو حضرت مولانا حسین احمد مدنی یہ نہ کہہ رہے ہوتے کہ پاکستان کا رقبہ تو بہت چیز ہے، ہمیں اگر اس کے کسی ایک شہر اور کوچہ کے بارے میں بھی یقین ہو کہ لیگی قیادت وہاں اسلام قائم کرے گی تو ہم خیمہ بردار ہو کے چلیں، اور نہ مولانا مودودی اپنے ان لوگوں سے جو پٹھانکوٹ میں اُنھیں سمجھانا چاہ رہے تھے کہ پاکستان بننے سے تو ہمارا کام بڑا آسان ہو جائے گا پس ہم اس کی تائید کریں، یہ فرماتے کہ تم نیبو کے درخت سے آم کھانے کی توقع کرتے ہو! وہاں اسلام کی بات کرنے والوں کو پھانسیاں ملیں گی۔ (اور مولیٰنا تو واقعی پھانسی سے بس بال بال بچے)۔

پاکستان بنوانے والی اصل طاقتیں دو تھیں۔ ایک قائدِ اعظم مسٹر جناح کی ذات، دوسرے علی گڑھ۔ دوسرے الفاظ میں کلیدی رول ان کا تھا، باقی بس حمایت یا زینت۔ اور یہ ان دونوں کے تصورِ اسلام ہی کا قصہ تھا جس نے حضرت مدنی اور مولانا مودودی سے وہ باتیں کہلوائیں، (یہاں یہ نہ بھولیے کہ یہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا علی گڑھ تھا، کوئی آج کے علی گڑھ پہ نہ جائے، آج تو وہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ پر یہ بدلا ہوا علی گڑھ ہندوستان کے حصہ میں آیا ہے۔) خیر، مگر اس کو کیا کیجیے! کہ دو ہی سال کے اندر جب پاکستان وجود میں آ گیا اور مولانا مودودی کو پٹھانکوٹ سے ہجرت کر کے وہاں آنا پڑ گیا تو اس

پاکستان نے ان سے خود ان کی بات کا یقین چھین لیا۔ اور جو کچھ وہ اس نیبو کے درخت سے آم کھانے کی کوشش میں کر سکتے تھے، اس میں کوئی دقیقہ اُٹھا کے انھوں نے نہیں رکھا۔ اسی میں ان کا ساتھ چھوڑتے ہوئے غالب کا وہ اوپر کا شعر مولانا امین احسن اصلاحی کو یاد آیا تھا۔ پرخوشی کی بات ہے کہ بالآخر (اگرچہ ذرا بعد از وقت) مولینا مودودی کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ سراب کے پیچھے دوڑتے اور لوگوں کو دوڑاتے رہے اور اب ان کا فرض ہے کہ اس کا اظہار کر دیں۔ اس قابلِ تحسین واقعہ سے ہم باہر لوگوں کو واقف کرانے کی نیکی مولانا کے ایک زمانہ کے پیرو جناب ارشاد احمد حقانی کے قلم سے انجام پائی۔ یہ موصوف کے ایک قسط وار کالم کا حصہ تھا جو یکم تا ۵ نومبر ۲۰۰۰ء روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔ مولانا نے اس کے مطابق اپنی جماعت کی شوریٰ میں اس مضمون کی ایک قرارداد پاس کرانی چاہی تھی کہ ہم پاکستان بننے کے بعد سے ایک غلط راستہ پر چلتے رہے۔ اب ضرورت ہے کہ اپنی صحیح راہ پر واپس جائیں۔ مگر یہ وہ وقت (۲۷ء) تھا کہ مولانا کے قوی جواب دے رہے تھے۔ وہ اَمارت بھی چھوڑ چکے تھے۔ ۷۵ء کا ماچھی گوٹھ والا رول اب وہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ رفقا حامی نہ ہوئے اور وہ بے بس ہو کے رہ گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

الغرض مسئلہ میں ایک تو یہ بنیادی عامل (فیکٹر) علی گڑھ والے اور قائدِ اعظم والے اسلام کا ہے۔ آپ اس سے تجاہل برت کر اس کو کالعدم نہیں کر سکتے۔ یہ ایک گہرا فکری عامل ہے۔ یہ پاکستان کی جڑوں میں پلایا ہوا ہے۔ یہ آپ کے والے (یعنی ''ملاّ'' والے) اسلام کی ہر قیمت پر مخالفت کرے گا۔ اس تصورِ اسلام کے لوگ آپ کی جد و جہد کو اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے کی ایک کوشش سمجھیں گے۔ اس کے ماسوا ایک دوسرا بڑا مخالف عامل پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اور دَر آیا تھا۔ اور یہ وہ ہے جس کا کھلا اعتراف خود اس اسلامی محاذ نے منصورہ کا مذکورۂ بالا اجتماع سفراء بلا کر کر لیا۔ یعنی پاکستان کے معاملات میں مغرب اور بالخصوص امریکہ کا فیصلہ کُن عمل دخل۔ یہ ایک کھلا راز ہے کہ پاکستان کے ایک ابتدائی قدم نے اُسے ایسا امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا تھا کہ کوئی حکومت وہاں امریکہ کی مرضی کے بغیر جب سے نہیں بنتی اور نہیں چلتی۔ مثالیں اتنی ہیں اور آئے دن دہرائی جاتی ہیں کہ اس اشارہ سے وہ یکا یک ذہنوں میں آ جائیں گی۔ پس علی گڑھ اور قائدِ اعظم کے تصورِ اسلام والے لوگ اگر از خود یا کسی دباؤ سے کچھ نرمی بھی اس مسئلہ پر برتنا چاہیں تو مغرب انھیں اجازت نہیں دینے والا۔ اور یہ غریب کہاں سے مزاحمت کا حوصلہ لا سکتے ہیں جب امریکہ دشمنی کے نعروں پر الیکشن جیتنے والے بھی اس کوشش میں لگے نظر آئیں کہ ان کے نعرے بھلا دیے جائیں؟

یقین ہے کہ یہ نعرے بھلا دیے جانے کی کوشش محض ایک سیاسی مجبوری کے طور پر تھی نہ کہ دل سے۔ اور کسی کو اگر شبہ رہا ہو تو ابھی مارچ کے مہینہ میں کارٹونوں کے مسئلہ پر احتجاج کو ان حضرات نے کارٹونوں سے زیادہ امریکہ و یورپ کی سیاست کے خلاف فضا بنانے کے لیے جس زور شور سے استعمال کیا، اس کے بعد کسی کا شبہ بھی قائم نہیں رہنا چاہئے، مگر یہ بات بہر حال طے ہو جاتی ہے اور اس کے ماننے سے مفر نہیں کہ پاکستان میں فی الحال (اور یہ ''فی الحال'' مختصر قسم کی چیز بظاہر نہیں) امریکہ اور یورپ کی رضا کے بغیر کوئی حکومت کا خواب دیکھے گا تو وہ خود کو دھوکہ دے گا۔ اور ان کی مرضی سے آ کر اسلام نافذ کرنے کا خواب دیکھنے والا اس سے بھی بڑھ کر دھوکہ کھانے کا شوقین ہوگا۔ پس ایک طرف باہر کی ان غیر مسلم طاقتوں کا نفوذ اور دوسری طرف پاکستان کی تأسیس میں پلایا ہوا لبرل اسلام، اِن دو اندرونی اور بیرونی مزاحم عوامل (مزید

برآں وڈیرے اور جاگیرداران) کے ہوتے ہوئے سیاست کی راہ سے اسلام کو سیاسی طاقت بنانے کی کوشش صرف اپنی قوتوں کا ضیاع ہی نہیں، اسلامی جد و جہد کے نام سے وابستہ اعلیٰ اصولی اور اخلاقی تصورات کو بھی لازماً مجروح کر کے رکھ دینے والا عمل ہے۔

دنیا میں رہ کر سیاست سے مفر یقیناً نہیں ہے، خاص کر جب کہ ملک کی سیاست انتخابی ہو۔ مضائقہ جو کچھ ہے وہ (مذکورہ قسم کی صورتِ حال میں) اسلام کو اس میدان میں لے کے آنے میں ہے۔ آخر کیوں ضروری ہے کہ ہم اسلامی نظام کا علم لے کر ہی سیاست میں آئیں؟ مگر نہیں، یہاں ہمیں متحدہ مجلسِ عمل کی اکائیوں میں سے جماعتِ اسلامی کو اس سوال سے باہر رکھنا ہوگا۔ وہ اسلام کی اس تعبیر پر ایمان رکھتی ہے جو اسے مولانا مودودی سے ملی۔ اور وہاں اس معاملہ میں شدت کا یہ عالم تھا کہ مصر کے کاروبارِ حکومت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شرکت کو ہمارے مفسرین نے جو بغیر اس مفروضہ کے لے لیا کہ آپ نے سلطنت کے ہول سول اختیارات حاصل کر لیے تھے، اس پر مولانا نے اِن مفسرین کے بارے میں جو تبصرہ اپنی تفسیر میں رقم فرمایا ہے، اس پر یقین اس کے بغیر آنا مشکل ہے کہ بعینہٖ الفاظ نقل کر دیے جائیں۔ مولٰنا کے الفاظ یہ ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دورِ انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں، ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبہ پر اتار لائے تا کہ اپنے لیے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔۔۔'' (تفہیم القرآن، حاشیہ آیت ۵۵)

پس ٹھیک ہے جماعت کو تو عذر ہو سکتا ہے۔ مگر باقی لوگوں، خاص کر مجلسِ عمل کی سب سے بڑی اکائی جو جمعیۃ علمائے اسلام سے عبارت ہے، اس کے لیے کوئی دقت نظر نہیں آتی۔ وہ جن بزرگوں کی دینی تشریح کے ماننے والے ہیں، وہ تو ایک زمانہ تک صد فی صد اسلامی حکومت کے سوا سیاست کا کوئی تصور نہ رکھنے اور اس کی راہ میں ہر بازی کھیلنے والوں میں سے ہونے کے باوجود جس دن اس نتیجہ پر پہنچے کہ فی الحال یا کم پر راضی ہو جانا ورنہ تن بہ تقدیر گوشہ میں بیٹھ جانا ہے، اسی دن وہ شرحِ صدر کے ساتھ اس پر تیار ہوئے کہ ملک (ہند) میں ایسے نظامِ حکومت کی جد و جہد کریں جس میں اسلامی احکام اگرچہ نافذ نہ ہوں، مگر مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی اسلام کے مطابق رکھنے، اسلام کا پیغام پھیلانے اور ان کاموں کے لیے ضروری ادارے قائم کرنے کی آزادی ہو۔ اور پھر یہ جد و جہد ان کی نگاہ میں ایسا فریضہ ٹھیری کہ گو وہ جانتے تھے مسلم لیگ کے اسلامی حکومت کے نعرہ کے مقابلہ میں وہ جیت نہیں پاویں گے اور بحیثیت علمائے دین کے جو وقار انھیں حاصل رہا ہے، اس کو بھی وہ خطرہ میں ڈالیں گے، ہندو سے پیسے لینے کا ذلیل الزام بھی ان پر لگا، اور ہاں مولانا مودودی کا حکومتِ الٰہیہ کی جد و جہد والا فکر بھی انھیں چیلنج کرنے کو سامنے آ چکا تھا، مگر ان میں سے کسی بات کا خوف اور دباؤ ان کے پاؤں میں لغزش نہیں پیدا کر سکا۔ اور آج حالات بانگِ دُہل شہادت دے رہے ہیں کہ یہ سوچ بالکل صحیح تھی۔ فکرِ مودودی کے جو وارثین بھارت میں رہ گئے تھے، چالیس برس تک اسی فکر کا پرچار کرتے رہنے کے بعد عملاً اس حقیقت سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ وہاں سیاست کی راہ سے اسلام کو غالب کرنے کی جد و جہد محض اُلٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (Counter Productive) عمل ہے۔ پس پاکستان میں بھی جب حالات کی زبان مسلسل پکار رہی ہے کہ دین کو سیاست میں لانے

کے لیے وقت ساز گار نہیں تو بغیر اسلامی نظام کے نعرے کے سیاست میں حصہ لیجئے اور اس قدر ضرور لیجئے کہ دین مخالف عناصر کو بالکل بے مہار ہونے کا موقع نہ ملے، دینی عناصر سیاسی لحاظ سے بے دست و پا نہ پائے جائیں اور اپنے علاقوں میں خدمتِ خلق کے لیے کسی درجہ کا عمل داخل سیاست کے ایوان میں رہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور مصر کے کاروبارِ حکومت میں شرکت کی جو بات اوپر آ گئی، اُسے غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی بالکل صاف صاف بس ایک آنے والی قدرتی آفت اور خلقِ خدا کے بیچ میں کھڑے ہو جانے کا رول تھا جس کا موقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو مہیّا کیا جا رہا تھا۔ اور اس میں یہ راز بھی تھا کہ خدمت کے اس فریضہ کی ادائیگی سے آپ کے لیے اپنے اُس کارِ نبوّت کی وسیع تر انجام دہی کی راہ اس دیارِ کفر میں کھلے گی جس کی ابتدا آپ نے جیل خانہ میں کر دی تھی۔ اور پھر بات آگے بڑھ کر بچپن کے خواب (''اِنّی رَاَیْتُ الشَّمْسَ والْقَمَرَ لی ساجِدِین'') کے حقیقت کے سانچہ میں ڈھل جانے تک پہنچے گی۔ فَصَدَقَ اللّٰہُ العظیم۔ شاہِ مصر کو اپنے ڈراؤنے خواب کی جو دل لگتی تعبیر صرف اپنے یہاں کے قیدی یوسفؑ سے ملی، اس نے اُس کے دل میں آپ کی وہ عظمت و منزلت قائم کی کہ کل تک جو قیدی تھا، اس سے بلا کسی درمیانی مرحلہ کے کہا جاتا ہے '' اَنّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنامَکِینٌ اَمین '' (تم آج سے ہمارے یہاں صاحبِ منزلت اور صاحبِ اعتماد ہو!) تو یہ محض تلافیٔ مافات نہیں تھی، شاہی خواب کے پس منظر میں یہ صاف طور پر بادشاہ کی (بادشاہانہ انداز میں) ایک درخواست بھی تھی کہ آنے والی قحط سالی کے مسئلہ سے نپٹنے کی ذمہ داری تم قبول کر لو! کیا اس پر اللہ کے نبی کو یہ جواب دے کر کہ ہاں ضرور، مگر پہلے گدّی خالی کر دو، بادشاہ کے اس نہایت قیمتی اعتماد اور قدر و منزلت کو تباہ کر دینا تھا (کہ اچھا ہم تو کوئی مردِ خدا رسیدہ سمجھے تھے، پر آپ تو تخت و تاج کی تاک میں نکلے!) یا بے تأمل یہ پیشکش قبول کرتے ہوئے بس اس ذمہ داری کی ضرورت کے مطابق اپنے دائرۂ اختیار کی بات کرنا تھی؟

لاریب کہ اللہ کے نبی (علیہ الصلاۃ والسلام) کو یہ دوسری بات ہی زیبا تھی اور اسی مفہوم میں اس کو کہنا تھا کہ: اِجْعَلْنی عَلیٰ خَزائِنِ الْاَرْضِ اِنّی حَفیظٌ عَلیمٌ! ہرگز ہرگز بادشاہ کا کفر اس سے مانع نہیں تھا کہ خلقِ خدا کی ایک غیر معمولی آزمائش کو اپنی اہلیت کے بقدر ہلکا کرنے کا جو موقع اس سلطنت میں اس اعزاز و اعتماد کے ساتھ مل رہا ہے، اسے قبول کریں۔ مگر ہاں، مولانا مودودی کی مجبوری ان کا وہ فہمِ دین تھا جس کی ترجمان ان کی کتاب '' قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' ہے۔ اس فہم کی رو سے واقعی حضرت یوسفؑ کو پہلے اسلامی نظامِ حکومت کا اختیار مانگنا تھا، پھر چاہے خدمت کا موقع رہتا نہ رہتا۔

پروفیسر شیخ عبدالرشید☆

آلودگی، دین فطرت اور ہم

آج کا دور آلودگی کا دور ہے۔ اس آلودگی کی تباہ کاریوں سے دنیا کو روشناس ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ پھر بھی جگہ جگہ اور بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ حضرت انسان کی طرف سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کیے جانے والے نت نئے تجربات کے باعث زمین کی فضا اس قدر زہریلی اور خطرناک ہو رہی ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو جلد ہی فضا اس قدر مکدر ہو جائے گی کہ کرہ ارض پر حیاتیاتی زندگی کا امکان باقی نہ رہے گا۔ بعض سائنس دان تو اس حد تک مایوس ہو چکے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ کرہ ارض پر زندگی چند برس کی مہمان ہے۔ زندگی کی مختلف جہتوں میں آلودگی کا زہر جس طرح سرایت کر گیا ہے، اس کے پیش نظر کئی ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ اتنا آلودہ فضا اور کثیف حالات میں انسان کا زندہ رہ جانا ہی ایک معجزہ ہے، تاہم وہ اس معجزے کے باوجود مستقبل کے بارے میں زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ چنانچہ اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انسان کو مکمل تباہی سے کیسے باز رکھا جائے؟ بظاہر یہ بڑا سیدھا سا سوال ہے لیکن اگر اس سوال کو محض تکنیکی یا سائنسی سمجھا جائے تو یہ ایک ایسی غلطی ہوگی جس کے نتائج کا تحمل شاید نہ کیا جا سکے۔ سب سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آلودگی پیدا کرنے والا انسان کس قسم کی حیاتیاتی، طبیعیاتی، نفسیاتی اور جذباتی حالت میں ہے اور کیا آج کے انسان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ زمین کو اس ممکنہ عذاب سے بچا لے جو خود اسی کے ہاتھوں ظہور میں آنے ہے؟

تہذیب انسانی کے ہر دور میں جن باتوں کو تبدیلی کے طور پر محسوس کیا جاتا ہے، ابتدا میں اکثر انہیں ترقی سمجھا جاتا ہے، لیکن بعد میں انہیں مراجعت تصور کیا جاتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ مبالغہ آمیزی شروع ہو جاتی ہے۔ آج سے پانچ چھ دہائیاں قبل نیوکلیر پاور کا پہلی بار تذکرہ ہوا تو یہ خیال کیا جانے لگا کہ اس ایجاد کی بدولت بجلی کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔ بعض مغربی ممالک نے تو اس کے ذریعے سے پانی کو منجمد کر کے اسے افریقہ کے صحرائے اعظم تک پہنچانے کے دعوے شروع کر دیے تھے۔ یہ پہلی منزل تھی، جسے ترقی کا نام دیا گیا، لیکن جب نیوکلیر پاور پلانٹ لگائے گئے تو پتہ چلا کہ انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کی بہت بڑی مقدار درکار ہوگی اور جب یہی گرم پانی خارج ہوگا تو وہ اس قدر زہر آلود ہو چکا ہوگا کہ پانی میں رہنے والی ہر جاندار شے تباہ ہو جائے گی۔ یہ دوسری یعنی مراجعت کی منزل تھی۔ چنانچہ اس کے پیش نظر کئی ناقدین ومخالفین نے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ نیوکلیر پاور کے ذریعے سے بجلی پیدا کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ یہ

☆ شعبہ سیاسیات۔ گورنمنٹ زمیندار کالج، گجرات۔ ibnemajeed@yahoo.com

تیسری منزل یعنی ردعمل کی انتہا تھی، ضرورت اس امر کی تھی کہ پانی کوٹھنڈا کرنے کا کوئی نعم البدل تلاش کر کے نیوکلیر ری ایکٹر سے جو فائدہ ہوسکتا ہے، اسے تو حاصل کیا جائے مگر اس کی وجہ سے جو آلودگی پیدا ہوتی ہے، اس سے بچا جا سکے۔

اسی مسئلے کو ایک اور تناظر میں دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ عصر حاضر میں اگر ایک طرف علم اور سائنس عروج پر ہے تو دوسری طرف مذہبی، روحانی اور اخلاقی اقدار زوال پزیر ہیں۔ اس اخلاقی وروحانی انحطاط نے آج کے انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر المیہ یہ ہوا کہ مادی ترقی کی دوڑ میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے انسان کے ذوق جمالیات میں تیزی سے کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ درحقیقت انسان کی جمالیاتی حس کی کمزوری ہی ذہنی، باطنی، فضائی اور ماحولیاتی بلکہ تمام اقسام کی آلودگیوں کا کلیدی سبب ہے۔ لہٰذا اگر ہم حقیقی معنوں میں کرہ ارض کو بچانے کے خواہش منداور آلودگی کے خاتمے کے آرزومند ہیں تو ہمیں انسانی روح کے اس روز بروز بڑھتے ہوئے سرطان کا علاج کرنا ہوگا جس نے ہمارے دلوں سے فطرت کے حسن و جمال کی قدر و قیمت اور احترام کو ختم کر دیا ہے، کیونکہ محض سائنسی معلومات اور مادی وسائل کے سہارے تسکین قلب کا حصول ممکن نہیں۔ مشہور انگریز شاعر لارڈ ٹینی سن نے اپنی ایک نظم میں کیا خوب بات کہی تھی:

Let knowledge flow from more to more
But more of reverence in us dwell

یعنی علم میں جتنا بھی اضافہ ہوتا جائے، وہ تو اچھا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں احترام کا جذبہ جاگزیں ہو۔ بلاشبہ ہمارے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم ممکنہ تباہی اور ہولنا کیوں سے محفوظ رہنے کے لیے آج کے انسان میں جمالیاتی حسن کو بیدار کر کے فطرت کے احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ دنیا جب سے قائم ہے، دانش مندوں، مفکروں، فلسفیوں، علما، حکما اور پیغمبروں نے فطرت کے حسن وصداقت اور فضیلت کے اعتراف واحترام کے ذریعے سے ہی روح کے سرطان اور ذوق جمالیات کے فقدان کا علاج کیا ہے۔

لاریب! فطرت کی رنگینی حسن کامل کے جن اصولوں پر کارفرما رہتی ہے، ان کے بارے میں فکر وتدبر سے کام لیا جائے تو ہمارا دل دائمی احساس احترام پر مجبور ہو جاتا ہے۔ صاحب بصیرت وبصارت جانتے ہیں کہ یہ کائنات جو بظاہر مادی دکھائی دیتی ہے، عملی اعتبار سے روحانی ہے۔ یہ درخشاں آسمان، زرخیز زمین، پہاڑوں کے ٹیکے، مہکتے ہوئے پھولوں کی گل کاریاں، شگفتہ غنچوں کی کیاریاں، بدلتے ہوئے موسم ومناظر، لہراتی ہوئی ندیاں، بل کھاتے دریا، اور شور مچاتی آبشاریں محض مفید ہی نہیں، ان کی خوبصورتی اور حسن ہمیں سرشار بھی کرتا ہے۔ اسی لیے تو جان کیٹس کو کہنا پڑا کہ خوبصورت چیز دائمی مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ فطرت کا حسن جہاں دل کو سکون اور راحت بخشتا ہے، وہاں قلب ونظر کو تمام آلودگیوں اور گردوغبار سے بھی پاک کرتا ہے۔ ممتاز قلمکار وکٹر ہیوگو نے اپنے عظیم شاہکار Les Miserables میں ایک پادری کا تذکرہ کیا ہے جو اپنے علاقے کا دورہ کرتے کرتے ایک ایسے مکان پر پہنچ گیا جو ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور وہاں سے ایک وادی نظر آتی تھی۔ جس شخص کا یہ مکان تھا، اس کے بارے میں گاؤں والوں نے پادری سے شکایت کی کہ یہ شخص اتنا غیر دیندار ہے کہ اتوار کے روز بھی گرجا گھر نہیں جاتا۔ چنانچہ پادری نے موقع پا کر اپنے میزبان سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور پوچھا کہ تم آخر اتوار کے دن عبادت میں کیوں شریک نہیں ہوتے۔ اس پر اس شخص نے پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

''جناب! ہر روز صبح کو جب میں اٹھتا ہوں اور اپنے کی چھت سے سورج کو نکلتے دیکھتا ہوں تو میرے دل سے بے ساختہ ایک آہ نکل جاتی ہے اور میں چپ چاپ کافی دیر تک قدرت کا یہ کرشمہ دیکھتا رہتا ہوں۔'' یہ سن نے پادری نے اس شخص کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا، میرے دوست جتنی بکواس میں کرتا رہتا ہوں، اس کے بجائے کاش میں بھی اس طرح خدا کی پرستش کر سکتا، جس جذبہ احترام کے ساتھ تم طلوع آفتاب کے منظر کو دیکھتے ہو۔'' اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے مجھے عالمی شہرت یافتہ شاعر فطرت ورڈزورتھ کے یہ خوبصورت خیالات یاد آ رہے ہیں:

"Nature never did betray
The heart that loved her; 'tis her privilege,
Through all the years of this our life, to lead
From joy to joy; for she can so inform
The mind that is within us, so impress
With quietness and beauty, and so feed
With lofty thoughts, that neither evil tongues,
Rash judgements, nor the sneers of selfish men,
Nor dreary intercourse of daily life
Shall ever prevail against us, or disturb
Our cheerful faith, that all which we behold
Is full of blessing."

''فطرت نے کبھی اس دل سے بے وفائی نہیں کی جس نے اس سے محبت کی۔ صرف فطرت ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہمیں زندگی بھر مسرتوں سے ہمکنار کرتی رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دل و دماغ کو اس طرح سکون اور خوبصورتی سے متاثر کر دیتی ہے اور ہمارے خیالات کو اتنا بلند کر دیتی ہے کہ پھر کوئی بات بھی ہمارے اس عقیدے کو متزلزل نہیں کر پاتی کہ ہمارے گرد و پیش جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے، اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ پھر نہ تو لوگوں کی بدزبانی دل پر اثر کر پاتی ہے اور نہ خود غرض لوگوں کی طنز و حقارت۔ پھر زندگی کی بے کیفی بھی دل کو مغموم نہیں کر پاتی۔''

صرف مغربی ادب ہی نہیں، خود ہماری مقدس آفاقی کتاب قرآن مجید میں غور کرنے والوں کے لیے چالیس ابواب میں فطرت اور حسن فطرت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ رحمٰن میں تو دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں، ریگستانوں کی جانب اور ان سب چیزوں کے درمیان جو کچھ ہے، ان کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے انسان ۲۳ مرتبہ ''فبای الآء ربکما تکذبٰن'' پکار اٹھتا ہے۔ سنسکرت کی ایک کہاوت ہے ''پنڈے سو برہمن ڈے'' جس کا مطلب ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے، وہی تمھارے جسم میں ہے۔ اسی لیے تو ہمیں بار بار یہ بتایا جاتا ہے اور بالکل صحیح بتایا جاتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور ہاں، اگر اسلام دین فطرت ہے تو پھر احترام فطرت عین اسلام ہے۔ یہ بات ہم تمام بنی نوع انسان کو نہ سہی، صرف امت مسلمہ کو ہی باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں تو یقین جانیے کہ ہر قسم کی آلودگی میں

بے حد کمی واقع ہو جائے۔ جس دین کے پیغمبر اعظم ﷺ نے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا ہو، اس کے پیروکاروں کا جسم، گھر، گلیاں اور محلّہ غلیظ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ اگر اسلام دین فطرت ہے تو پھر کیا دھویں اور غلاظت سے فضا اور پہاڑوں، ندیوں، نالوں اور حسن فطرت کو نقصان پہنچانے والے سچے مسلمان ہوسکتے ہیں؟ ہر مسلمان کے دل میں احترام فطرت کا جذبہ جاگزیں ہونا لازم ہے۔ ہمیں اپنی تعلیم وتبلیغ میں اسلام کے اس خوبصورت پہلو کا تذکرہ خوب کرنا ہوگا۔ ہم سب کا فرض ہے کہ یہ جذبہ پیدا کر کے ایمان کو مضبوط بنائیں اور آلودگی کا خاتمہ کریں، کیونکہ دھیرے دھیرے ہمارے جسم میں دوڑتے ہوئے خون کی طرح آلودگی ہمارے ماحول کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ یہ لکڑی میں دیمک کی طرح ہمارے ماحول کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اسے روکنا، اس کے خلاف جہاد کرنا ہم سب کا سماجی ودینی فریضہ ہے اور اگر ہم خدانخواستہ اسے روکنے میں ناکام رہے تو پھر وہ دن دور نہیں جب اس کرہ ارض پر آلودگی تو ہوگی، مگر انسان نہیں ہوگا۔

تصحیح

الشریعہ کے اپریل ۲۰۰۶ء کے شمارے میں میاں انعام الرحمٰن صاحب کے مقالہ ''سیرت نبوی اور ہجرت: ایک معنویاتی مطالعہ'' میں ''اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، اور امیہ بن خلف کو اپنی رحمتوں سے دور کر دے'' کے الفاظ میں ایک دعا غلطی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔ (ص ۳۴، سطر ۴) یہ الفاظ حقیقت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں۔ ادارہ اس فروگزاشت پر معذرت خواہ ہے۔ (مدیر)

مولانا افتخار تبسم نعمانی ☆

مسئلہ طلاق ثلاثہ اور فقہاے امت

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک دفعہ تین طلاقیں دے دے تو کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟ اس مسئلے میں علماے اہل سنت میں ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے۔ جمہور علما کے نزدیک یہ فعل (بیک وقت تین طلاق دینا) حرام ہے، تاہم اگر کسی نے ایسا کیا تو تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اس کے برعکس فقہا اور محدثین کی ایک قابل لحاظ تعداد اس کی قائل ہے کہ اس صورت میں ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ تمام اہل علم ہمیشہ سے اس مسئلے کو ایک اختلافی مسئلے کے طور پر نقل کرتے آئے ہیں اور کسی نے اس پر اجماع کا یا اس میں اختلاف کی گنجایش نہ ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ اکابر اہل علم کے حوالہ جات حسب ذیل ہیں:

امام طحاوی حنفیؒ اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فذهب قوم الى ان الرجل اذا طلّق امراته ثلاثا معا فقد وقعت عليها واحدة اذا كانت فى وقت سنّته وذلك ان تكون طاهرا فى غير جماع واحتجّوا فى ذالك بهذا الحديث (شرح معانی الاثار ج۲ص۳۵)

’’ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ مرد جب اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی جبکہ وقت سنت میں یعنی اس وقت دی گئی ہو کہ عورت پاک ہو اور اس سے ہم بستری نہ کی گئی ہو اور دلیل ان کی یہی حدیث ہے۔‘‘

امام صاحب کی مراد صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ، عہد صدیقیؓ اور حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔

امام عینی حنفیؒ لکھتے ہیں:

وفيه اختلاف فذهب طاوس و محمد بن اسحاق والحجاّج بن ارطاة والنخعى وابن مقاتل والظاهرية الى ان الرجل اذا طلق امراته ثلاثا معا فقد وقعت عليها واحدة ،واحتجّوا بحديث ابى الصهباء

☆ چاہ عمر، کہروڑ لعل عیسن، ضلع لیہ۔

(عمدۃ القاری ج ۲۰، ص ۲۳۳ طبع جدید مصر)

''اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام طاوس، محمد بن اسحاق، حجاج بن ارطاۃ، نخعی، محمد بن مقاتل اور ظاہر یہ اس طرف گئے ہیں کہ جب آدمی اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے تو وہ ایک ہی شمار ہوں گی اور انہوں نے مسلم شریف کی حدیث ابی الصہباءؒ سے استدلال کیا ہے۔''

امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:

قد اختلف العلماء فيمن قال لامراته انتِ طالق ثلاثا ..... وقال طاؤس وبعض اهل الظاهر لا يقع بذلك الّا واحدة وهو رواية عن الحجّاج بن ارطاة ومحمد بن اسحاق۔ (شرح صحیح مسلم، ج ۱۰ ص ۷۰)

''اس میں اختلاف ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینے کا کیا حکم ہے..... اور امام طاوس (تابعی) اور بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہیں کہ اس طرح ایک ہی طلاق واقع ہوگی، اور یہی حجاج بن ارطاۃؒ اور محمد بن اسحاق بن یسار المدنیؒ سے مروی ہے''۔

امام رازی شافعیؒ لکھتے ہیں:

ثم القائلون بهذا القول اختلفوا على قولين، الاوّل وهو اختيار كثير من علماء الدين انه لو طلقها اثنين او ثلاثا لا يقع الّا الواحدة وهذا القول هو الاقيس لان النهى يدل على اشتمال المنهى عنه على مفسدة راجحة والقول بالوقوع سعى فى ادخال تلك المفسدة فى الوجود وانه غير جائز فوجب ان يحكم بعدم الوقوع (تفسیر کبیر، ج ۶ ص ۱۰۳، طبع جدید)

''پھر اس قول کے قائلین میں اختلاف ہو گیا اور ان کے دو قول ہیں۔ ایک قول جو بہت سے علماے دین کا اختیار کردہ ہے، یہ ہے کہ اگر اس نے بیک وقت دو یا تین طلاقیں دیں تو صرف ایک واقع ہوگی۔ اور یہی قول قیاس کے زیادہ موافق ہے کیونکہ کسی چیز کی ممانعت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ممنوع چیز میں فساد اور خرابی کا پہلو غالب ہے، جبکہ تین طلاقوں کو واقع مان لینے سے اس مفسدہ اور خرابی کو وجود میں لانے کی کوشش ہے جو جائز نہیں، لہٰذا عدم وقوع (یعنی بیک وقت تین طلاقوں کے نہ ہونے) کا حکم لگانا واجب اور ضروری ہے۔''

امام فخر الدین رازیؒ کے اس بیان سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ یہ مسلک زیادہ قرین قیاس ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ مسلک شاذ مسلک نہیں بلکہ بہت سے علماے دین کا اختیار کردہ ہے۔

قاضی ابو الولید ابن رشد مالکی اندلسیؒ لکھتے ہیں:

جمهور فقهاء الامصار على ان الطلاق بلفظ الثلاث حكمه حكم الطلقة الثالثة وقال اهل الظاهر وجماعة حكمه حكم الواحدة ولا تاثير للفظ فى ذالك (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۶۱)

''جمہور فقہاے امصار کا کہنا یہ ہے کہ تین کے لفظ سے جو طلاق دی جائے گی، اس کا حکم تیسری طلاق کا ہے، جبکہ اہل ظاہر اور ایک جماعت کا قول ہے کہ اس کا حکم ایک طلاق کا حکم ہے اور تین کا لفظ یہاں غیر موثر ہے۔''

اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

کانّ الجمهور غلبوا حکم التغليظ فی الطلاق سدّا للذريعة ولکن تبطل بذلك الرّخصة الشرعيّه والرفق المقصود ۔

''جمہور نے اس صورت میں گویا سدِ ذریعہ کے طور پر سختی کے پہلو کا زیادہ لحاظ رکھا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے وہ شرعی رخصت اور سہولت اور نرمی فوت ہو جاتی ہے جو کہ مطلوب ہے۔''

یعنی بیک وقت تین طلاقوں کو تین شمار کر لینے سے وہ رخصت وسہولت ختم ہو جاتی ہے جو متعدد ومتفرق مواقع پر دینے میں ہے۔ اس سے قاضی ابن رشدؒ کا اپنا رجحان بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین طلاقوں کا حکم ایک ہی طلاق کا ہونا چاہیے تاکہ شرعی رخصت وسہولت باطل نہ ہو۔

امام قرطبیؒ اپنی شہرہ آفاق تفسیر میں آیت کریمہ 'الطلاق مرّتن' کے تحت لکھتے ہیں:

ذکر احمد بن محمد بن مغيث الطليطلیّ هذه المسئلة فی وثائقه ثم اختلف اهل العلم بعد اجماعهم علی انه مطّلِق کم يلزمه من الطلاق، فقال علی بن ابی طالب وابن مسعودؓ يلزمه طلقة واحدة وقاله ابن عباسؓ، ... و قال الزّبيرؓ بن العوامّ وعبد الرحمن بن عوفؓ وروينا ذلك کله عن ابن وضاّح وبه قال من شيوخ قرطبة ابن زنباع شيخ هدی ومحمد بن تقی بن مخلد ومحمد بن عبد السلام الحسنی فريد وقته وفقيه عصره واصبغ بن الحباب وجماعة سواهم (الجامع لاحکام القرآن، ج ۳،ص ۱۲۹، ۱۳۲ طبع مصر)

''اور امام احمد بن محمد بن مغیث طلیطلی اندلسی نے یہ مسئلہ کتاب الوثائق میں ذکر کیا ہے۔.... پھر اہل علم اس بات پر اجماع کے بعد کہ طلاق بدعت واقع ہو جائے گی، اس میں مختلف الرائے ہوئے کہ کتنی طلاقیں واقع ہوں گی۔ تو حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک طلاق کو واقع مانتے ہیں اور یہی بات حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے ارشاد فرمائی ہے اور یہی رائے حضرت زبیر بن عوّام اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ہے۔ یہ سب باتیں ہم نے امام محمد بن وضاّح سے نقل کی ہیں، اور یہی موقف شیوخ قرطبہ میں سے ابن زنباع شیخ ہدی، محمد بن تقی بن مخلد اور یگانہ روزگار وفقیہ دوراں محمد بن عبدالسلام الحسنی اور اصبغ بن حباب اور ان کے علاوہ ایک جماعت کا ہے۔''

مشہور مفسر اور نحوی امام ابو حیاّن 'الطلاق مرّتن' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے مراد دوالگ الگ اور متفرق اوقات میں طلاق دینا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ 'الطلاق مرّتن' سے میرے دل میں ہمیشہ یہی بات آتی ہے کہ طلاق دینے والا مرد اگر ایک مجلس اور ایک وقت میں دو یا تین طلاقیں دے تو ایک ہی طلاق واقع

ہونی چاہیے۔(البحر المحیط، ص۱۹۲، ج۲)

امام نظام الدینؒ نیشاپوری اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

ثم من ہولاءِ من قال لو طلقہا ثنتین او ثلاثا لایقع الّا واحدۃ وھذا ھو الاقیس واختارہ کثیر من علماء اھل البیت لان النھی یدل علی اشتمال المنھی عنہ علی مفسدۃ راجحۃ والقول بالوقوع سعی فی ادخال تلک المفسدۃ فی الوجود (تفسیر نیشابوری علیٰ ہامش ابن جریر ص۳۶۱ ج۲)

''پھران میں سے وہ ہیں جنہوں نے کہا کہ بیک وقت دو یا تین طلاقیں دینے کی صورت میں ایک ہی طلاق واقع ہوگی اور یہی قول قیاس کے سب سے زیادہ موافق ہے اور اسے کثیر علمائے اہل بیت نے اختیار کیا ہے کیونکہ کسی چیز سے منع کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ چیز کسی بڑے مفسدے اور خرابی پر مشتمل ہے اور بیک وقت تین طلاقوں کو تین شمار کر لینا اس مفسدے اور خرابی کو وجود میں لانے کا سبب ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حنبلی لکھتے ہیں:

وقد ثبت فی الصحیح عن ابن عباسؓ عنھما قال کان الطلاق علی عھد رسول اللہ ﷺ وابی بکرؓ وصدرا من خلافۃ عمرؓ طلاق الثلاث واحدۃ وثبت ایضا فی مسند احمد انّ رکانۃ بن عبد یزید طلق امراتہ ثلاثا فی مجلس واحد فقال النبی ﷺ ھی واحدۃ ولم یثبت عن النبی ﷺ خلاف ھذہ السنۃ بل ما یخالفھا امّا انہ ضعیف بل مرجوح واما انہ صحیح لا یدل علی خلاف ذلک کما قد بسط ذلک فی موضعہ واللہ اعلم۔(فتاویٰ ج۳ص۸۶)

''مسلم شریف کی صحیح حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں اور خلافت عمرؓ کے ابتدائی دور میں تین طلاقیں ایک ہی سمجھی جاتی تھیں۔اور مسند احمد کی روایت سے ثابت ہے کہ حضرت رکانہ بن عبد یزیدؓ نے اپنی بیوی کو مجلس واحد میں تین طلاقیں دیں لیکن نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایک ہی طلاق ہوئی ہے۔ نبی ﷺ سے اس سنت کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہے۔اس کے خلاف جو کچھ مروی ہے، وہ یا تو ضعیف بلکہ مرجوح ہے، اور یا صحیح ہے لیکن اس سے اس کے خلاف بات ثابت نہیں ہوتی، جیسا کہ دوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔واللہ اعلم۔''

امام حافظ ابن قیمؒ حنبلی نے اپنی کتب اغاثۃ اللہفان، زاد المعاد اور اعلام الموقعین میں طلاق ثلاثہ کے مسئلہ پر بہت مفصّل، جامع اور مدلّل گفتگو کی ہے۔چنانچہ اجماع صحابہؓ کی نسبت حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق دونوں طرح کی روایات ہیں۔بعض میں ہے کہ وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے ایک ہونے کا فتویٰ دیتے تھے اور بعض روایات میں اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ طلاق مغلظ ہونے کا فتویٰ دیتے تھے، لیکن حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، طاؤس، محمد بن اسحاق، فلاس بن

عمرو، حارث عکلی، داؤد بن علی اور ان کے اکثر اصحاب، بعض اصحاب مالک، بعض اصحاب حنفیہ اور، بعض اصحاب احمد بن حنبل ان سب کا فیصلہ یہ تھا کہ طلاق ثلاثہ کا حکم ایک طلاق کا ہے۔ (اعلام الموقعین ج ۲، ص ۱۴ تا ۳۲)

اغاثۃ اللہفان میں لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہؒ سے اس مسئلے میں دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک تو وہی جو مشہور ہے۔ دوسری یہ کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک رجعی طلاق ہوتی ہیں، جیسا کہ امام محمد بن الحسن الشیبانی (۱۳۲ھ۔۱۸۹ھ) کے تلمیذ رشید امام محمد بن مقاتل الرازی الحنفیؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے۔ (ص ۱۵۷، طبع مصر)

امام مازریؒ نے بھی اپنی کتاب ''المعلم'' میں محمد بن مقاتل حنفیؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ طلاق ثلاثہ جو ایک ساتھ ہوں، وہ ایک رجعی طلاق کے حکم میں ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

امام حافظ ابن حجر صحیح بخاری کے ''باب من جوّز الطلاق الثلاث'' (جس نے تین طلاق کو جائز قرار دیا) کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وفی الترجمة اشارة الی انّ من السلف من لم یجز وقوع الطلاق الثلاث (فتح الباری ج ۹ ص ۲۸۹)

''اس عنوان میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سلف میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تین طلاق کے وقوع کو جائز قرار نہیں دیتے۔''

اس رائے پر اعتراض نقل کر کے اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

الرابع انه مذهب شاذ فلا یعمُل به واجیب بانهّ نقل عن علیٍّ وابن مسعودؓ وعبد الله بن عوفؓ والزبیرؓ مثله نقل عنه ذلك ابن مغیث فی کتاب الوثائق له وعزاه لمحمّد بن وضاّح ونقل الغنوّی ذلك عن مشائخ قرطبة کمحمد بن تقی بن مخلد ومحمد بن عبد السلام الحسینیؒ وغیرهما ونقله ابن المنذر عن اصحاب ابن عباسؓ کعطاء وطاوس وعمر وبن دینارٍ ویتعّجب من ابن التیّن حیث جزم بأن لزوم الثلاث لا اختلاف فیه و انما الاختلاف فی التحریم مع ثبوت الاختلاف کما تریٰ (فتح الباری، جلد، ۹، ص ۲۹۰)

''چوتھی بات یہ کہی گئی ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے ایک ہونے کی بات شاذ مسلک ہے، اس لیے اس پر عمل نہ ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ رائے حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ سے منقول ہے۔ اسے ابن مغیث نے اپنی کتاب الوثائق میں نقل کی ہے اور اسے امام محمد بن وضاّح کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور غنوی نے اس مسلک کو قرطبہ کے مشائخ کے ایک گروہ مثلاً محمد بن تقی بن مخلد اور محمد بن عبد السلام الحسینیؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ اور ابن المنذر نے اسے حضرت عبداللہ ابن عباس عنہما کے اصحاب مثلاً عطا، طاؤس، اور عمرو بن دینار سے نقل کیا ہے۔ اور ابن التین پر حیرت ہے کہ انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ تین طلاق کے لازم ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ اختلاف صرف اس کے حرام ہونے میں ہے، حالانکہ جیسا

کہ تم دیکھ رہے ہو، تین طلاق کے لازم ہونے یا نہ ہونے میں بھی اختلاف ثابت ہے''۔

محدث شہیر امام شوکانیؒ نے مذکورہ اہل علم کے علاوہ یہی مسلک جابر بن زید، ہادی، قاسم، باقر، ناصر، احمد بن عیسیٰ، عبد اللہ بن موسیٰ بن عبد اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام زید بن علی بن حسینؓ کا بھی نقل کیا ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۶ ص ۲۴۵)

مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں:

والقول الثانی انه اذا طلق ثلاثا تقع واحدة رجعية وهذا هو المنقول عن بعض الصحابة وبه قال داود الظاهری واتباعه وهو احد القولين لمالك ولبعض اصحاب احمد (عمدۃ الرعایہ ج ۲ ص ۷۱ مطبع انوار محمدی لکھنو)

''(اس مسئلے میں اختلاف ہے) اور دوسرا قول یہ ہے کہ جب ایک ساتھ تین طلاقیں دی جائیں تو ایک رجعی طلاق ہوگی۔ اور یہ رائے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اور اسی کے قائل امام داؤد ظاہریؒ اور ان کے اتباع ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق یہی مذہب امام مالکؒ اور امام احمد بن محمد بن حنبلؒ کے بعض اصحاب کا ہے۔''

مفتی اعظم قطر علامہ شیخ عبداللہ بن زید آل محمود، شیخ الازہر علامہ شیخ محمود شلتوت مرحوم (الفتاویٰ ص ۳۰۶)، علامہ سید رشید رضا مصریؒ (تفسیر 'المنار' ج ۹ ص ۶۸۳) اور عہد حاضر کے جلیل القدر عرب عالم اور مفسر شیخ جمال الدین قاسمی (الاستیناس لتصحیح انكحة الناس) طلاق کے مسئلہ پر نہایت مفصل گفتگو کے بعد یہی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ جو تین طلاقیں بیک دفعہ دی جائیں، ان سے ایک طلاق رجعی ہی واقع ہوگی۔

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ کا فتویٰ حسب ذیل ہے:

''اس مسئلہ میں درست بات یہ ہے کہ اگر مرد ایک کلمہ سے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے تو وہ ایک ہی شمار ہوگی، جیسا کہ امام مسلمؒ نے اہل علم کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے، اور کئی دوسروں نے بھی اس بات کو اختیار کیا ہے اور امام محمد بن اسحاق صاحب السیرۃ بھی اسی بات کے قائل ہیں اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی یہی بات اختیار کی ہے۔''

علمائے دیوبند میں سے مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا محمد محفوظ الرحمٰن قاسمی اور مولانا عمر احمد تھانویؒ بھی طلقات ثلاث بیک مجلس کو ایک طلاق رجعی قرار دیتے ہیں۔ علمائے بریلی میں سے جسٹس پیر کرم شاہ ازہری رحمہ اللہ بھی علمائے مصر اور علمائے جامع ازہر کے فتویٰ کے مطابق عمل کرنے کو ارجح قرار دیتے ہیں۔

ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کا موقف اہل علم کی ایک بڑی تعداد نے اختیار کیا ہے۔ اصول فتویٰ کی رو سے اگر کوئی رائے ائمہ اربعہ نے اختیار نہ کی ہو لیکن وہ ضرورت اور مصلحت کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہو تو اس پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ بحر العلوم عبدالعلی حنفیؒ 'التحریر' لابن الہمامؒ کی شرح میں فرماتے ہیں:

واما المجتهدون الذين اتبعوهم باحسان فكلهم سواء فی صلاحهم فان

وصل فتویٰ سفیان بن عیینہؒ او مالك بن دینار یجوز الاخذ به كما یجوز الاخذ بفتویٰ الائمة الاربعة الّا انه لم یبق عن الائمة الاخرین نقل صحیح الا اقلّ القلیل ولذا منع من التقلید ایّاهم فان وجد نقل صحیح منهم فی مسئلة فالعمل به والعمل بفتویٰ الائمة الاربعة سواء۔

''وہ مجتہدین جوصحابہ کرام کے اچھے پیرو ہیں، وہ سب کے سب صلاحیتِ تقلید میں برابر ہیں (یعنی ائمہ اربعہ علیہم الرحمہ کی تخصیص نہیں) اگر سفیان بن عیینہؒ یا مالک بن دینارؒ کا فتویٰ مل جائے تو اس پر بھی اسی طرح عمل کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ ائمہ اربعہ کے فتوے پر عمل کرنا جائز ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے اقوال نقل صحیح کے ساتھ کم تر ہی مہیا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے ان کی تقلید سے روکا ہے، تاہم اگر کسی مسئلے میں نقل صحیح کے ساتھ ان کی رائے مل جائے تو اس پر عمل کرنا اور ائمہ اربعہ کے فتوے پر عمل کرنا دونوں برابر ہیں۔''

فواتح الرحموت شرح مسلّم الثبوت میں بھی بحر العلومؒ نے یہی بات تحریر کی ہے۔ (ص ۶۳۰، طبع نول کشور ۱۸۷۸ء)

شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں امام محمد رحمہ اللہ کی امالی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی فقیہ کو طلاق بتہ دے دے اور اس کے نزدیک طلاق بتہ سے مراد طلاق ثلاثہ ہو، لیکن کوئی قاضی یہ فیصلہ کر دے کہ طلاق رجعی ہوئی ہے تو طلاق دینے والے فقیہ کے لیے جائز ہے کہ اپنے مسلک کے برخلاف قاضی کے فتوے پر عمل کرے اور اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ (ج ۱، ص ۳۹۰)

مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ (م ۱۳۰۴ھ) نے اسی اصول پر حسب ذیل فتویٰ دیا ہے:

''اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک تین طلاقیں ہوں گی اور بغیر تحلیل کے نکاح درست نہ ہوگا مگر بوقت ضرورت کہ اس عورت کا علیحدہ ہونا اس سے دشوار ہو اور احتمال مفاسد زائدہ کا ہو تو کسی اور امام کی تقلید کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ نظیر اس کی مسئلہ نکاح زوج مفقود اور عدّت ممتدّۃ الطہرُ موجود ہے کہ حنفیہ عند الضرورۃ قول امام مالکؒ پر عمل کر لینے کو درست رکھتے ہیں، چنانچہ ''ردّ المختار'' میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔''

(مجموعہ فتاویٰ ص ۳۴۷)

مفتی حبیب المرسلینؒ (دار الافتاء مدرسۃ امینیہ دہلی) فتویٰ دیتے ہیں:

''بوجہ شدید ضرورت اور خوف مفاسد اگر طلاق دینے والا ان بعض علما کے قول پر عمل کرے گا جن کے نزدیک اس واقعہ مرقومہ میں ایک ہی طلاق ہوتی ہے تو وہ خارج از مذہب حنفی نہ ہوگا، کیونکہ فقہاے حنفیہ نے بوجہ شدّت ضرورت کے دوسرے امام کے قول پر عمل کرنے کو جائز لکھا ہے۔'' (بحوالہ الجواہر العالیہ، الاعظمی مدظلہ)

مفتی نایف بن احمد الحمد☆

غصے کی حالت میں دی گئی طلاق کا حکم

سوال: گزشتہ ہفتے میں نے اپنی حاملہ بیوی کو طلاق دے دی تھی اور یہ ہماری شادی کے بعد کی تیسری طلاق تھی۔ چندروز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ شدید غصے کی حالت میں طلاق دینے والے کے بارے میں علمائے کرام نے بتایا ہے کہ ایسا شخص غصے کی شدت کے لحاظ سے تین قسم کے حالات سے ہوسکتا ہے:

۱۔ غصے کی ایسی حالت جس میں طلاق دینے والا وقتی طور پر آپے سے باہر ہوجاتا ہے اور یہ احساس کھو بیٹھتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایسی حالت میں دی جانے والی طلاق نافذ نہیں ہوتی۔

۲۔ غصے کی ایسی حالت جو اول الذکر سے کم ہو لیکن بہت ہی شدید غصے کی حالت ہو، اس کیفیت میں دی جانے والی طلاق کی بابت علمائے کرام اور ائمہ عظام اختلاف کرتے ہیں کہ آیا یہ طلاق نافذ ہوگی یا نہیں۔ جن ائمہ کرام نے اس طلاق کے نافذ نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے، ان میں ہمارے ملک کے مفتی اعظم ابن باز، دوسرے بزرگ عالم ابن عثیمین اور سلف میں سے حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ شامل ہیں۔

۳۔ مذکورہ بالا دو کیفیات سے کم درجے کا غصہ۔ اس حالت میں تمام علمائے کرام کے نزدیک طلاق نافذ ہوجائے گی۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دو برس پہلے جب میں نے اپنی بیوی کو پہلی طلاق دی تھی تو میری کیفیت دوسری قسم کے غصہ کی حالت تھی اور اس وقت مجھے طلاق کے مفصل احکام کا علم نہیں تھا اور میں نے پہلی طلاق کو ایک طلاق شمار کیا تھا۔ کیا اب جبکہ مجھے اس بابت معلوم ہوگیا ہے کہ حالت دوم میں بعض علمائے کرام طلاق کو نافذ نہیں مانتے تو میرے لیے یہ باور کرنا جائز ہے کہ دو برس پہلے جو میں نے پہلی طلاق دی تھی، وہ نافذ نہیں ہوئی؟ طلاق دیتے ہوئے میں نے اس فرق کو بہرحال ملحوظ خاطر رکھا تھا جسے علمائے کرام طلاق شرعی اور طلاق بدعی کہتے ہیں، اور میں نے دو یا تین طلاقیں سنت طریقے کے مطابق دی تھیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کرلوں مگر حلال طریقے سے اور سنت نبوی کی رو سے۔ تو کیا ایسا کرنا از روئے شریعت میرے لیے جائز ہے؟

جواب: الحمد للہ وحدہ وبعد

غصے کی تین کیفیات علمائے کرام نے بیان کی ہیں: (۱) ایسا غصہ جس میں انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے اور اسے

☆ فاضل جج علاقہ رماح، سعودی عرب۔

معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس حالت میں تمام علمائے کرام کے نزدیک طلاق نافذ نہیں ہوتی۔ (۲) ایسا غصہ جس میں طلاق دینے والا شخص اپنے ہوش وحواس میں ہوتا ہے اور جو الفاظ وہ ادا کرتا ہے، وہ بھی اور اس کے نتیجے سے بھی آگاہ ہوتا ہے، اگرچہ وہ غصے میں ہی ہوتا ہے تو ایسی طلاق بالاتفاق نافذ ہو جاتی ہے۔ (۳) غصے کی تیسری حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اس میں طلاق دینے والا اگرچہ مکمل طور پر اپنے ہوش وحواس نہیں کھو بیٹھتا مگر یہ غصہ اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس کے الفاظ اور نیت کا رابطہ وقتی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور غصہ کافور ہونے کے بعد اسے اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے اور اب اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں جو طلاق دی جائے، اس کے نافذ ہونے یا نافذ نہ ہونے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور ہمارے نزدیک ایسی حالت میں طلاق کا وقوع پذیر نہ ہونا زیادہ راجح ہے۔ امام ابن قیم اغاثۃ اللہفان میں فرماتے ہیں کہ 'و الادلة الشرعية تدل علی عدم نفوذ طلاقه'۔ شریعت کے احکام اس طلاق کے عدم وقوع پر دلالت کرتے ہیں اور یہی قول ہمارے استاذ محترم ابن تیمیہؒ کا بھی ہے۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: 'ان غيره الغضب ولم يزل عقله لم يقع الطلاق' کہ اگر ایسا غصہ ہو کہ اس سے ہوش وحواس مکمل طور پر معطل نہ ہوئے ہوں تو طلاق وقوع پذیر نہ ہوگی، کیونکہ غصے کی شدت نے اس سے یہ حرکت کرائی ہوتی ہے۔ وہ بہر حال اس بات کو ناپسند کرتا تھا کہ اپنی بیوی سے گلوخلاصی کرالے۔ اس حالت میں وہ کوئی صحیح فیصلہ کرنے کی حالت میں نہیں رہتا اور اس کا حکم اس شخص کا ہے جو طلاق دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے، یعنی طلاق المکرَہ۔ امام ابن تیمیہؒ مزید لکھتے ہیں کہ یہ وہی حالت ہے جس میں اس کی بددعا بھی قبول نہیں ہوتی جبکہ وہ اپنی یا مال کے لیے ہلاکت کی دعا کرتا ہو۔ اسی طرح اس حالت میں اگر وہ نذر مانتا ہے، کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی بظاہر اطاعت مقصود ہوتی ہے، تو یہ نذر بھی پوری کرنا اس پر واجب نہیں ہے۔

اسی رائے پر ہمارے معزز استاد مکرم ابن باز کا بھی فتویٰ ہے۔ یہی حکم مسند احمد، ابوداؤد اور حاکم کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: 'لا طلاق في اغلاق' کہ اغلاق کی حالت میں طلاق نافذ نہیں ہوتی۔ لفظ اغلاق کا معنی امام احمد اور ابوداؤدؒ نے غضب (غصہ) کیا ہے۔ ابن قیمؒ کی اس موضوع پر ایک جامع تالیف موجود ہے جس میں وہ قرآن مجید کی آیات، احادیث مبارکہ اور صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے اقوال جمع کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ عدم وقوع ہی زیادہ قرین قیاس اور اصول شریعت کے موافق ہے۔ ہمارے نزدیک بھی امام ابن قیمؒ کے دلائل مضبوط اور قابل اطمینان ہیں۔ جسے توفیق ہو، وہ ان کی تالیفات سے رجوع کر سکتا ہے۔

بنابریں آپ کی پہلی طلاق مذکورہ بالا اقسام میں سے اگر تیسری قسم سے تعلق رکھتی ہے اور آپ کی بیوی بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہو کہ واقعتاً وہ طلاق انتہائی غصے کی حالت میں دی گئی تھی، مزید برآں اس پہلی طلاق کی توثیق مملکت کی کسی عدالت نے بھی نہیں کی ہے تو پہلی طلاق نافذ نہیں سمجھی جائے گی۔ ہاں اگر آپ کی زوجہ محترمہ آپ کے اس دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتی ہیں یا مسلمان قاضی نے اس طلاق کی توثیق کر دی ہے تو یہ طلاق نافذ ہوگئی، کیونکہ اختلافی (شخصی) مسائل میں (حاکم) نامزد قاضی کا فیصلہ نافذ العمل ہوتا ہے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

(بشکریہ سہ ماہی ایقاظ، ملتان۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵)

تبلیغی جماعت اور دین کا معاشرتی پہلو

(۱)

☆ سید جمال الدین وقار ☆

تبلیغی جماعت کو کارکنوں کی تعداد اور جغرافیائی پھیلاؤ کے لحاظ سے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ جماعت ہر اس ملک میں متحرک ہے جہاں مسلمان کسی بھی قابل لحاظ تعداد میں بستے ہیں۔ اس کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں شمالی بھارت کے علاقے میوات میں رکھی گئی تھی اور اس نے عامۃ الناس کی سطح پر اسلامی تعلیمات سے آگاہی اور شعور کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ چند سال قبل بمبئی میں میری ملاقات چند تبلیغی بھائیوں سے ہوئی جنھوں نے مجھے تبلیغی کام کے لیے کچھ وقت نکالنے کی ترغیب دی۔ آئندہ سالوں میں، میں نے کئی تبلیغی دورے کیے اور دور دراز دیہات اور قصبوں کا سفر کیا جہاں میں نے ایسی مسلمان برادریاں بھی دیکھیں جو اسلام کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھیں۔ کچھ ایسے مسلمان بھی مجھے ملے جو اقرار شہادت کے بنیادی عقیدے یعنی 'اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا رسول الله' سے بھی واقف نہیں تھے۔ تبلیغی بھائیوں کے زیر اثر ان مسلمانوں کو بنیادی عقائد مثلاً کلمہ شہادت، نماز اور روزے وغیرہ کے طریقے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ چنانچہ مجھے اس قابل قدر کردار کا احساس ہوا جو تبلیغی جماعت مسلمانوں کے ان طبقات میں اسلامی شعور پھیلانے کے سلسلے میں ادا کر رہی ہے جن تک کسی دوسری مسلمان تنظیم نے ابھی تک رسائی حاصل نہیں کی۔

تبلیغی جماعت جس بے حد اہم کام میں مصروف ہے، میں اب بھی اس کی بے حد تحسین کرتا ہوں۔ البتہ مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ یہ تحریک اگر اپنے طریق کار میں چند معمولی تبدیلیاں پیدا کر لے تو یہ مسلمان کمیونٹی کے معاملات میں پہلے سے زیادہ تعمیری کردار ادا کر سکتی ہے۔ تاہم میں اس بات کو بھی جانتا ہوں کہ تبلیغی قیادت کے کچھ حلقے کسی بھی قسم کی تبدیلی کے خلاف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے مخصوص مفادات پر زد پڑے گی۔

تبلیغی جماعت کا نیٹ ورک پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ جماعت کے کارکن بھارت کے اندر اور بیرون ملک مسلسل متحرک رہتے ہیں اور اپنے کام کے دوران میں ان کا لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔ ذرا تصور کریں کہ کارکنوں کے اس نیٹ ورک کو اگر بنیادی اسلامی عقائد اور اعمال کے ساتھ ساتھ عمومی معاشرتی شعور، جدید تعلیم خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم اور معاشرتی ہم آہنگی کے تصورات کے فروغ کے لیے بھی استعمال کیا جائے تو کس قدر عظیم الشان اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جماعت کے کارکن، اس کے برخلاف، ایسا کوئی کام نہیں کرتے۔ بنیادی عقائد کی تبلیغ کے

علاوہ ان کے پاس اپنی گرفت میں آنے والے سامعین کو تخیلاتی کہانیاں اور من گھڑت قصے، جن کی نسبت وہ بے بنیاد طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف کر دیتے ہیں، بے تکان سناتے چلے جانے کے سوا کوئی کام نہیں۔ ''فضائل اعمال'' کے نام سے تبلیغی جماعت کی بنیادی نصابی کتاب جسے ممتاز تبلیغی عالم مولانا محمد زکریا نے تصنیف کیا ہے، کمزور اور موضوع روایات سے بھری پڑی ہے اور بہت سے مسلمان علما اس کے متعلق تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

''فضائل اعمال''، جسے بہت سے تبلیغی حضرات زبانی نہیں تو عملاً ضرور قرآن مجید سے زیادہ بڑی اتھارٹی سمجھتے ہیں، عمومی طور پر اس دنیا سے نفرت اور کراہت کا پیغام دیتی ہے۔ تبلیغی کارکنوں کی زبان سے یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ ''دنیا کی مثال ایک بیت الخلا یا قید خانے کی ہے۔'' وہ بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ''ان کی گفتگو کا موضوع یا تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جو اوپر آسمان پر ہیں اور یا وہ جو زمین کے نیچے قبر میں ہیں۔ درمیان کی دنیا کے بارے میں وہ کوئی بات نہیں کرتے۔'' دوسرے لفظوں میں تحریک کا عمومی جذبہ ایسا ہے جو دنیا سے بے زار رہبانیت کو فروغ دیتا ہے جس کی قرآن مجید میں صریحاً ممانعت کی گئی ہے۔

دنیا سے نفرت اور کراہت کا نتیجہ تحریک سے وابستہ افراد میں دوسرے لوگوں کی تکلیفوں کے بارے میں بے حسی کی صورت میں نکلتا ہے۔ تبلیغی کارکن جماعت کے پیدا کردہ مزاج کے باعث لوگوں کی تکالیف اور پریشانیوں کو اللہ کی طرف سے ان کے گناہوں کی سزا قرار دے کر انسانی مصائب کو کم کرنے میں ہر قسم کی ذمہ داری سے بآسانی بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ نیز اس طریقے سے معاشرتی ظلم اور جبر کے اصل اسباب سے بھی توجہ ہٹا دی جاتی ہے اور اس طرح ظلم وجبر کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط تر کر دیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں نے بہت سے تبلیغی حضرات سے سنا ہے کہ وہ فلسطین میں مسلمانوں کے وحشیانہ قتل وغارت کو اسلامی تعلیمات سے انحراف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ صہیونی توسیع پسندانہ عزائم کے مقابلے کے لیے تبلیغی کارکنوں کے پاس ایک ہی سادہ سا حل ہے: ''اگر فلسطینی مسلمان نمازیں ادا کرنا، سنت کے مطابق مسواک سے دانت صاف کرنا اور تبلیغی دوروں پر باقاعدگی سے جانا شروع کر دیں تو ان کے سارے دلدر فوراً دور ہو جائیں گے۔'' چنانچہ اس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ جہاں اسرائیل میں دوسری اسلامی تحریکوں کو سختی سے دبایا جاتا ہے، اسرائیلی حکومت تبلیغی جماعت سے چشم پوشی کرتی ہے جو غالباً نادانستہ طور پر مسلمانوں کے مابین بے حسی اور باہمی لاتعلقی کو فروغ دے رہی ہے۔

یہ رویہ اس قدر گہرا ہے کہ بالکل مقامی سطح پر بھی، جہاں مصائب کے ازالہ کے لیے مداخلت سے کسی کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا، میں نے تبلیغی کارکنوں کو مکمل طور پر الگ تھلگ اور لاتعلق پایا ہے۔ استثنائی مثالیں موجود ہیں، لیکن ان سے عمومی صورت حال ہی کی توثیق ہوتی ہے۔ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے نئی دہلی کی بستی نظام الدین میں واقع تبلیغی جماعت کے عالمی مرکز کی مثال دوں گا۔ اس مرکز کے باہر جسمانی معذوروں، کوڑھ کے مریضوں اور نشے کے عادی لوگوں کا ایک جم غفیر دردانگیز طور پر بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔ میں نے ایک ممتاز تبلیغی رہنما سے، جو اپنا زیادہ تر وقت مرکز میں گزارتے ہیں، پوچھا کہ تبلیغی رہنما اپنے دروازے پر پڑے تکلیف سے بے حال ان لوگوں کی مدد کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں بالکل ہی بدھو ہوں اور کہا: ''کیسا احمقانہ سوال ہے! تم دیکھتے نہیں کہ ہم ان لوگوں کو دنیا کی سب سے قیمتی دولت سے بہرہ یاب کر رہے ہیں؟ ہم انھیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سکھا رہے ہیں جو انھیں مرنے کے

بعد جنت میں لے جائیں گی۔ وہاں انھیں ہر قسم کی نعمتیں میسر ہوں گی، وہ بڑے بڑے محلات میں بے شمار خادموں کے ساتھ رہیں گے اور ہزاروں حوریں ان کے حبالہ نکاح میں ہوں گی۔ اس سے بڑی دولت انھیں کوئی کیا دے سکتا ہے؟''

میں نے ان کی جوش اور غضب سے بھرپور تقریر کو اطمینان سے سنا اور پھر انھیں قرآن مجید کی چند آیات اور دو تین حدیثیں یاد دلائیں جن میں کہا گیا ہے کہ غریبوں کو آسمانی نعمتوں کا مژدہ سنانا اور جنت میں خالی تخیلاتی محل بنانا کافی نہیں بلکہ مادی لحاظ سے ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے بے لحاظی سے میری بات کاٹ دی اور کہا: ''تم چاہتے ہو کہ ہم ان کے لیے سکول کھول لیں؟ انھیں کاروبار شروع کرنے میں مدد دیں؟ یہ سب کام مسیحی مشنریاں کرتی ہیں لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ان سب چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم انھیں اگلے جہان کی دولت سے نواز رہے ہیں جس کے مقابلے میں وہ سب کچھ جس کی مسیحی مشنریاں پیش کش کرتی ہیں، محض ترس کھا کر کچھ مدد امداد کر دینے (pathetic pittance) کی حیثیت رکھتا ہے۔'' حقیقی دنیا میں غریبوں کے مصائب سے مکمل بے حسی کا جواز ثابت کرنے کے لیے اس سے زیادہ ذہانت آمیز کوئی دلیل نہیں گھڑی جا سکتی۔

تبلیغی حضرات میوات کے علاقے کو، جہاں سے تحریک کا آغاز ہوا، اپنی کامیاب ترین تجرباتی زمین سمجھتے ہیں۔ میوات جو کہ میو قبیلے کا علاقہ ہے، ثقافتی لحاظ سے ایک منفرد علاقہ ہے جس میں ہریانہ کے دو ضلعوں گڑگاؤں اور فرید آباد اور راجھستان کے دو ضلعوں الور اور بھارت پور کے کچھ حصے شامل ہیں۔ اس علاقے میں تبلیغی جماعت ۱۹۲۰ء کی دہائی سے متحرک ہے۔ جماعت کی محنت کے نتیجے میں میو قوم میں کافی تبدیلی آ چکی ہے۔ وہ بے حد نمایاں غیر اسلامی رسم ورواج اور اعتقادات کو ترک کر چکے ہیں اور علاقے میں بہت سی مسجدیں اور مدرسے قائم ہو چکے ہیں۔ یہ سب اچھے نتائج ہیں اور بے شمار تبلیغی کارکنوں کی طویل، صبر آزما اور ان تھک جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

تاہم تبلیغی تحریک اگر میو قوم میں مذہبی سطح پر بعض بڑی اصلاحات لانے میں کامیاب ہوئی ہے تو سماجی سطح پر اس کی کامیابیاں کم متاثر کن ہیں۔ میو عورتیں آج بھی کھیتوں میں مویشیوں کی جگہ کام کرتی ہیں، کم وبیش تمام میو عورتیں جائیداد میں اپنے جائز حق سے محروم رہتی ہیں، جہیز کی لعنت عام ہے، میو قوم میں شرح خواندگی ۱۰ فیصد ہے اور سو میں سے صرف ۲ میو لڑکیاں خواندہ ہیں۔ پوری کمیونٹی مجموعی لحاظ سے بے حد غربت زدہ ہے۔ اس قوم کی قابل رحم حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرنے کے بجائے تبلیغی حضرات نے دنیاوی معاملات سے اپنی نفرت کی وجہ سے اسے مزید خراب ہی کیا ہے۔ حالیہ سالوں میں محدود تعداد میں کچھ این جی اوز نے تو میوات میں خواندگی اور معاشی ترقی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے، لیکن تبلیغی کارکنوں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ میوات کے تبلیغی کارکن اکثر یہ بات کہتے سنائی دیتے ہیں کہ جب میو لوگ غریب اور ناخواندہ تھے تو اس وقت نیک اور پرہیزگار تھے لیکن اب جبکہ ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنی مالی صورت حال بہتر بنا لی ہے، وہ خدا کو بھول گئے ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہوگی اور مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں لیکن اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ تبلیغی حضرات دین کو کوئی ایسی چیز سمجھتے ہیں جو بنیادی طور پر دنیا کے مخالف ہے، جبکہ یہ خیال میری رائے میں خود اسلام اور عام دنیاوی معاملات کو دیکھنے کا قطعی طور پر غیر اسلامی زاویہ نگاہ ہے۔

میرے فہم کے مطابق اسلام غریبوں کی خدمت پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ صرف یہ نہیں کہ انھیں اسلام کی خوبیاں

اور جنت کی نعمتیں سنادی جائیں، خاص طور پر حوریں جن سے تبلیغی حضرات کو خبط کی حد تک دل چسپی ہے، بلکہ مادی لحاظ سے بھی ان کی مدد کی جائے۔ یہ اپنے پیروکاروں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اللہ کے حقوق بھی پورے کریں اور بندوں کے حقوق بھی ادا کریں۔ مجھے یقیناً اعتراف کرنا چاہیے کہ تبلیغی حضرات حقوق اللہ کی تبلیغ میں زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن حقوق العباد کو انھوں نے مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ دوسروں کی مدد کرنے کے فضائل بیان کر دیتے ہیں، لیکن عملاً اس قسم کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دیتے۔ آپ تصور کریں کہ اگر نظام الدین دہلی مرکز میں تبلیغی حضرات ایک ماڈل سکول قائم کر لیں اور اس میں اسلامی اور عصری تعلیم دینا شروع کر دیں یا غریبوں کے لیے ایک ہسپتال قائم کر دیا جائے یا بے روزگار لوگوں کے لیے صنعتی تربیت کا کوئی مرکز بنا دیا جائے تو یہ ایک تجربہ عالمی سطح پر کن اثرات ونتائج کا حامل بن سکتا ہے۔ وہ لاکھوں تبلیغی کارکن جو ہر سال نظام الدین مرکز میں آتے ہیں، اسلام کی سماجی اخلاقیات کو عملی صورت میں دیکھیں گے اور اس سے ان کو ترغیب ملے گی کہ وہ واپس اپنے علاقوں میں جا کر اسی طرح کے منصوبے شروع کریں۔ تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، نظام الدین کے تبلیغی رہنما اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان پر اپنے بالکل قریب تڑپتی اور سسکتی انسانیت کے دکھوں کا سرے سے کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

جہاں تک میں نے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے، میں اس بات کا شدت سے قائل ہوں کہ جنت کا راستہ صرف مسلسل دعاؤں اور (تبلیغی انداز میں) مناجات کرنے میں نہیں ہے بلکہ فرض رسوم کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مادی اور روحانی ضروریات کے لیے جدوجہد کرنے میں ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ غریبوں کو خیرات دے دی جائے۔ یہ طریقہ غربت کے خاتمے میں بالکل معاون نہیں بلکہ اس کو مزید پختہ کر دیتا ہے۔ غریبوں کی حقیقی خدمت یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعاون کر کے انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی جائے تا کہ وہ مستقبل میں اپنے سے زیادہ ضرورت مند لوگوں کی خدمت کے قابل ہو سکیں۔ لیکن یہ منطق تبلیغی جماعت کے ذہنی مزاج کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ جیسا کہ بہت سے تبلیغی سمجھتے ہیں، اگر کوئی شخص پابندی سے تبلیغی دورے کرتا ہے، لمبی ڈاڑھی رکھ لیتا ہے، مسلسل تسبیح کے دانے گھماتا رہتا ہے اور سنت کے مطابق مسواک سے دانت صاف کرتا ہے تو جنت میں اس کا داخلہ پکا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ذاتی پسند اور ناپسند کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کے چند ظاہری اعمال کی نقل کر کے وہ جنت میں اپنی جگہ پکی کر رہے ہیں۔ ایک مثال لیجیے۔ حال ہی میں مجھے پاکستان کے ایک تبلیغی مصنف کی ایک کتاب دیکھنے کا موقع ملا جس میں انھوں نے کسی ثبوت کے بغیر یہ بلند بانگ دعویٰ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص پابندی سے تبلیغی جماعت کے دوروں پر نکلتا رہے تو جنت میں اس کا داخلہ یقینی ہے جہاں، دوسری لذتوں کے علاوہ، اسے تین لاکھ حوروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی ملے گا۔ اس طرح کی گھٹیا ذہنی رشوتیں تبلیغی جماعت سے وابستہ ہونے والے لوگوں کو باقاعدگی سے دی جاتی رہتی ہیں اور ایک لحاظ سے دیکھیں تو اس سے جماعت کے اس قدر وسیع پیمانے پر فروغ کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔

تبلیغی حضرات کے نزدیک بنیادی فرائض کی ظاہری رسوم کی مسلسل ادائیگی سے جنت میں داخلہ یقینی ہو جاتا ہے۔ جنت جب اس طرح آسانی سے مل رہی ہو تو فطری طور پر، بہت کم لوگ غریبوں اور مجبور ومقہور لوگوں کے لیے کچھ کرنے میں

دلچسپی لیں گے جو کہ میری رائے میں دونوں جہانوں میں اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا حقیقی ذریعہ ہے۔ قرآن مجید بار بار اہل ایمان سے یہ کہتا ہے کہ نجات پیغمبر ﷺ کے طریقے کی اتباع میں مضمر ہے۔ تبلیغی حضرات اس سے اختلاف نہیں کرتے لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو محض چند ظاہری اعمال تک محدود کر دیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ بس ان کی پیروی کرنے سے آدمی سیدھا جنت میں جا سکتا ہے۔ چنانچہ تبلیغی پمفلٹوں اور کتابچوں میں اس بات کی اہمیت بے تکان اجاگر کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھاتے کیسے تھے، مسکراتے کیسے تھے، دھوتے کیسے تھے، دانت کیسے صاف کرتے تھے، جوتے کیسے پہنتے اور اتارتے تھے، مونچھیں کیسے تراشتے اور ڈاڑھی کو کیسے بڑھاتے تھے وغیرہ۔ یوں جیسے رسول اللہ ﷺ کی سنت کے دائرے میں صرف یہی چند شخصی اعمال آتے ہیں۔ سنت کو ان اعمال تک محدود کر کے اور اس کی محض ظاہری شکل میں محصور کر کے وہ سنت کو اس کی اصل اور حقیقی روح سے محروم کر دیتے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ موجودہ تبلیغی قیادت میں خود تنقیدی اور خود احتسابی یا اپنا طرز عمل تبدیل کرنے پر آمادگی کی کوئی علامات پائی جاتی ہیں۔ چونکہ جماعت کا طریق تبلیغ اور اس کا بنیادی نصاب یعنی ''فضائل اعمال'' اس کی تعارفی خصوصیات بن چکی ہیں اور انہوں نے جماعت کا ایک مخصوص امتیازی تشخص قائم کیا ہے، اس لیے بالکل واضح طور پر تبلیغی قیادت جماعت کے تشخص کے کمزور پڑنے کے ڈر سے اس میں کسی قسم کی تبدیلی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس سے مآل کار خود ان کی اتھارٹی کا دعویٰ کمزور ہو جائے گا۔ تبلیغی کارکن اور واعظ باصرار یہ کہتے ہیں کہ یہ طریق تبلیغ کسی انسان کی ایجاد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے الہام کے ذریعے سے براہ راست بانی جماعت مولانا محمد الیاس علیہ الرحمہ کو سمجھایا گیا۔ اس وجہ سے ان کا اصرار ہے کہ اس میں کسی تبدیلی کا مشورہ دینا اللہ کی مرضی اور حکم کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ اس طریقے سے وہ ہر قسم کی تنقید، اور اصلاح کی دعوت سے پیچھا چھڑا لینا چاہتے ہیں۔

اپنے بے حد مخلص اور محنتی تبلیغی بھائیوں کو میرا مشورہ ہے کہ آپ مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی عقائد کی تعلیم دینے کے زبردست کام میں بے شک لگے رہیں کیونکہ بہت کم مسلمان یہ ذمہ داری انجام دے رہے ہیں، لیکن جیسا کہ قرآن مجید ہمیں بار بار ترغیب دیتا ہے، اپنی عقل وفہم کو بھی استعمال کیجیے اور کوئی کام صرف اس وجہ سے نہ کرنا شروع کر دیجیے کہ اسے آپ کے بڑے (تبلیغی اصطلاح میں ''بزرگ'') کرتے ہیں۔ اس کی صحت کو قرآن مجید کی روشنی میں پرکھیے۔ اپنی رہنمائی کا ماخذ قرآن مجید کو بنائیے نہ کہ کسی انسان کی لکھی ہوئی کتاب کو (خواہ وہ ''فضائل اعمال'' کے مصنف کی طرح کوئی شیخ الحدیث ہی کیوں نہ ہو)۔ تب آپ پر واضح ہوگا کہ اللہ کی رحمت کے حصول کا صحیح طریقہ دعا اور عبادات کا ذوق وشوق بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنا بھی، چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، خدا کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(ترجمہ: ابوطلال۔ بشکریہ http://www.islaminterfaith.org/)

(۲)

☆ اوریا مقبول جان ☆

عصر کی نماز کے بعد یا مغرب کی نماز سے ذرا پہلے گھروں کے دروازوں پر دستک دیتے قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی

طرح کے چہرے جن کے ماتھوں پر محراب، سر پر عمامہ، ٹوپی یا رومال، لباس کی وضع قطع شریعت کے قواعد وضوابط کے مطابق اور گفتگو میں تحمل پایا جاتا ہے، آپ کو یقیناً نظر آتے ہوں گے۔ اپنے لڑکپن سے آج تک میں دین کی محنت میں لگے ہوئے لوگوں کو دیکھتا آ رہا ہوں۔ آپ چاہے ناگواری کا اظہار کریں، تمسخر اڑائیں یا توجہ سے بات نہ سنیں، ان کی جبین پر شکن تک نہیں آتی۔ یہ لوگ بلا کے ہیں۔ ایسے لگتا ہے ان کو اپنے پڑوس کی، شہر کی، ملک کی بلکہ پوری دنیا کے عوام کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ ان کا تردد ان کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے۔ یہ اپنی محنت سے اور مسلسل گفتگو سے چند لوگوں کو قائل کر لیتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ اس بیان میں شریک ہوں جو مسجد میں عموماً مغرب کی نماز کے بعد منعقد ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے ایسے ہی چند مزید گروہ گلیوں اور محلوں میں نکل جاتے ہیں۔ اپنی اس تگ ودو اور محنت کو یہ لوگ ''گشت'' کہتے ہیں۔ یہ گشت صرف اپنی گلی یا محلے تک محدود نہیں رہتا بلکہ ملکوں ملکوں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

ان لوگوں کی زندگیوں کی ظاہری آب وتاب ایسے لگتی ہے جیسے عبادت کے تمام سلیقے ان کو ازبر ہیں۔ آداب نماز سے لے کر روزہ، تراویح اور اعتکاف سب اس انہماک سے ادا کرتے ہیں کہ ان پر رشک آتا ہے۔ ان کی گفتگو آخرت کے خوف سے پر اور جنت کی لذتوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ یہ کسی بھی ادارے میں کام کر رہے ہیں یا کسی کاروبار کی اساس ان کے ہاتھ میں ہے، ان کا رنگ ڈھنگ دور سے پہچانا جاتا ہے۔ لوگ ان سے محبت بے شک نہ کریں، لیکن نفرت نہیں کرتے۔ ایک طویل عرصے تک یہ ''گشت'' صرف ایک گروہ تک محدود تھا لیکن اب ایسے ہی گشت کچھ اور لوگوں نے بھی اختیار کر لیے اور اب میرے ملک میں لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے بے چین لوگ جا بجا نظر آئیں گے۔

مجھے ان لوگوں کی بود وباش، فقر وغنا اور سینے کی تڑپ اچھی لگتی ہے۔ یہ لوگ کتنے دردمند ہیں کہ دوسرے کی آخرت بچانے کے لیے بے چین ومضطرب ہیں، لیکن میں اس سارے پس منظر میں ایک عجیب وغریب بات سوچتا رہتا ہوں اور پھر ان سوچوں کے بھنور سے نکل نہیں پاتا۔ یہ لوگ جس مملکت خداداد پاکستان کی گلیوں اور محلوں میں خدائے واحد کا فرمان لیے گھوم رہے ہوتے ہیں، وہاں ۱۴ کروڑ کی آبادی میں ۵ کروڑ کے قریب ایسے گھرانے بھی آباد ہیں جنھیں اتنا بھی رزق میسر نہیں کہ ان کی زندگی کی گاڑی چل سکے۔ یہ لوگ ہوسکتا ہے کسی ایسے دروازے پر دستک دے دیں جہاں ماں نے بچوں کو پانی میں نمک مرچ گھول کر سوکھی روٹی کے ساتھ پیٹ بھر کر سلایا ہو اور باپ اس فکر میں غلطاں ہو کہ کل اس گھر میں پیٹ کے ایندھن کا سامان کہاں سے آئے گا۔ ہوسکتا ہے ان لوگوں نے راہ چلتے ایک ایسے شخص کو روکا ہو کہ جو دن رات دہاڑی دار مزدوروں کے اڈے پر ہر رکتی ہوئی گاڑی کے پاس التجا والے چہرے کے ساتھ لپکا ہو، لیکن دن کا سورج ڈھلنے تک اسے مزدوری کے لیے کوئی اپنے ساتھ نہ لے کر گیا ہو۔ بوجھل قدموں سے یہ شخص اپنے گھر کی سمت کس پریشانی کے عالم میں لوٹ رہا ہوگا۔ ان بندگان خدا کی دستک ایسے دروازوں پر بھی ہوسکتی ہے جہاں چند دن پہلے کسی باپ نے بازار سے زہر خریدا اور بھوک سے بے تاب، کھانے کی آرزو میں تڑپتے بچوں کی خوراک میں ڈالا اور پھر ان کے ساتھ کھانا کھا کر موت کی نیند سو گیا ہو۔ یہ کسی بے روزگار نوجوان، کسی بے کس، محروم اور بے آسرا کے سامنے بھی اپنی بات بیان کرتے ہوں گے۔ یہ اس باپ کے سامنے بھی جاتے ہوں گے جس نے رزق حلال سے اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی ہو، لیکن وہ روزگار سے اس لیے محروم رہے کہ ان کی رسائی کسی سیاست دان، کسی جرنیل یا کسی اعلیٰ افسر کی دہلیز تک نہ تھی اور آج ان کو غربت وافلاس

کی زندگی میں صرف سفارش اور رشوت کے خلاف بددعائیں ہی یاد آتی ہوں گی۔

انھی خیالوں میں گم میں ایک محفل میں جا نکلا جہاں ایسا ہی شخص لوگوں کو ترغیب دے رہا تھا کہ کیا تم نے کبھی جا کر دیکھا کہ تمھارا پڑوسی نماز پڑھتا ہے کہ نہیں۔ وہ جہنم کی آگ کی طرف جا رہا ہے اور تم اسے بچانے کے لیے کیوں نہیں دوڑتے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا اور مجھے سرکار دو عالم کی وہ احادیث یاد آنے لگیں۔ آپ نے فرمایا ''جو اپنے بھائی کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتا ہے اور پانی پلاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ سے سات خندق دور فرما دیتا ہے۔ دو خندقوں کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔'' آپ نے فرمایا ''بھوکے کو کھانا کھلانا مغفرت واجب کرنے والے اعمال میں سے ہے۔'' آپ نے ابن عباس سے فرمایا ''جو مسلمان کسی مسلمان کو کپڑا پہناتا ہے تو جب تک پہننے والے کے بدن پر اس کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہتا ہے، پہنانے والا اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے۔'' ایک جگہ فرمایا ''مسکین کو اپنے ہاتھ سے دینا بری موت سے بچاتا ہے۔'' آپ نے فرمایا ''آگ سے بچنے کی کوشش کرو، چاہے آدھی کھجور ہی دے کر کرو۔'' حضرت عائشہ کہتی ہیں ''میرے پاس ایک سائل آیا۔ میں نے اسے کچھ دینے کو کہا۔ پھر بلایا اور دیکھا کہ اسے کیا دیا۔ آپ نے فرمایا، تم یہی چاہتی ہو نا کہ گھر میں جتنا آئے اور جتنا خرچ ہو، اس کا تمھیں علم ہو۔ فرمایا جی ہاں۔ فرمایا، حساب کتاب کے چکر میں نہ پڑو۔ گن گن کر نہ دو، ورنہ اللہ تمھیں بھی گن گن کر دے گا۔''

میں خواب دیکھنے والا شخص ہوں۔ خواب دیکھتا رہتا ہوں کہ شاید ایک دن ایک ایسا ''گشت'' بھی نکلے گا، اپنے کندھوں پر اپنا مال و دولت لادے ہوئے، اور مسجدوں کے دروازے سے نکل کر گھروں پر دستک دیں گے: ہے کوئی بھوکا، ہے کوئی نادار، ہے کوئی مسکین، ہم سے کھانا کھالو اور ہمیں جہنم کی آگ سے بچالو، ہماری پوشاک پہن لو اور ہمیں اللہ کی حفاظت میں جانے دو۔ ہمارے ہاتھ سے بغیر گنے سب کچھ لے لو تا کہ اللہ ہمیں بے حساب عطا کرے۔ عصر کے بعد، مغرب سے پہلے، ماتھوں کے محراب، سروں پر عمامے اور کندھوں پر مال و متاع لادے کوئی ایک گشت تو ایسا نکلے!

(بشکریہ روزنامہ جنگ۔ ۲۵ جون ۲۰۰۵)

اعتذار

[الشریعہ کے مئی ۲۰۰۶ کے شمارے میں ''غامدی صاحب کے اصولوں کا ایک تنقیدی جائزہ'' کے زیر عنوان حافظ محمد زبیر صاحب کا مقالہ شائع ہوا تھا جس میں نقل کردہ اقتباسات کے حوالہ جات ہماری کوتاہی کی وجہ سے درج نہ کیے جا سکے۔ مصنف اور قارئین، دونوں سے بے حد معذرت کے ساتھ یہ حوالہ جات یہاں شائع کیے جا رہے ہیں۔ (مدیر)]

ص۲۵	''قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔...... سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔''	ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴ ص۱۱
ص۲۶	''بائبل تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحف سماوی .... آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔''	ایضاً، ص۱۶
ص۲۶	''اے خداوند..... میں تیری مدح سرائی کروں گا۔''	ایضاً، ص۱۸
ص۲۶	''تو ایسا ہوا..... خداوند کی ستایش کی کہ وہ بھلا ہے۔''	ایضاً، ص۱۷
ص۲۶،۲۷	''جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے..... کلام کے اصل مدعا سے تجاوز ہوگا۔''	ایضاً، ص۱۲
ص۲۷	''اور ان حاشیوں پر..... (فرشتے) بنے ہوئے تھے۔''	اشراق، جون ۲۰۰۰ ص۳۴
ص۲۷	''اور الہام گاہ میں...... دس دس ہاتھ اونچے بنائے۔''	ایضاً
ص۲۷	''اس میں کوئی شبہ نہیں ...... نبی ﷺ نے انھیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے۔''	اشراق، جنوری ۹۶ ص۶۱
ص۲۷	''اور خداوند کا کلام.... اور اس کے خلاف نبوت کر۔''	اشراق، اکتوبر ۱۹۹۰ ص۵
ص۲۷،۲۸	''اپنے اس علاقے سے.... انھی کے قبضے میں ہیں۔''	ایضاً، ص۱۰
ص۲۹	''جاندار چیزوں....... منسوب کر دیا گیا ہوگا۔''	تدبر قرآن، ج۶ ص۳۰۴
ص۲۹،۳۰	''پیغمبروں کے دین میں..... استعمال کا ذکر آیا ہے۔''	اشراق، مارچ ۲۰۰۴ ص۱۶

ص۳۰،۳۱	''سوال یہ ہے کہ قرآن میں..... حدیث کس طرح منسوخ کرسکتی ہے۔''	اشراق،نومبر۱۹۸۹،ص۳۶۔۳۸
ص۳۱،۳۲	''سوم یہ کہ..... قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔''	میزان،ص۵۲
ص۳۲،۳۳	''حضرت عیسیٰؑ کی آمد ...... حتمی بات کہنا ممکن نہیں۔''	اشراق،جنوری۱۹۹۶،ص۶۰،۶۱
ص۳۴	''اور جب وہ زیتون..... گمراہ کریں گے۔''	متی،۲۴:۳۔۵
ص۳۴	''انہوں نے اس سے...... نزدیک آپہنچا ہے۔''	لوقا،۲۱:۷۔۹
ص۳۴	''میں تیرے پاس...... کیونکر برتاؤ کرنا چاہیے۔''	تیمتھیس،۳:۱۴،۱۵
ص۳۵،۳۶	''پر اگر یہ بات سچ ہو..... طلاق نہ دینے پائے۔''	استثنا،۲۲:۲۰۔۲۴،۲۸،۲۹
ص۳۶	"عن البراء بن عازب قال ..... فی الکفار کلها"	صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا
ص۳۸	''ہمارا نقطہ نظر..... دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا۔''	اشراق،جنوری۹۶،ص۶۱
ص۳۸	''کسی طرح کسی کے فریب.... ....ساتھ ہوگی۔''	تھسلنیکیوں،۲:۳۔۱۰
ص۳۸	"انی انذرکموہ .... ان اللہ لیس باعور"	صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب کیف یعرض الاسلام علی الصبی
ص۳۹	"سمعت رسول اللہ ﷺ یقول یقتل ابن مریم الدجال بباب لد"	سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی قتل عیسی بن مریم الدجال
ص۳۹	"ارایتم ان قتلت ..... فلا یسلط علیه"	صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب فی صفۃ الدجال

مکاتیب

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرم محمد عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

ماہنامہ 'الشریعہ' میں اپنا مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس پر میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس مضمون کے حوالے سے راقم کو ذاتی طور پر مختلف اصحاب علم کی طرف سے تبصرے بھی موصول ہوئے جن میں چند باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ان میں کچھ باتیں غلط فہمی کا نتیجہ تھیں جن کا ازالہ میں ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ 'الشریعہ' میں میرا تعارف صحیح شائع نہ ہو سکا۔ میں نے آپ کی طرف جو خط لکھا تھا، اس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ میں ریسرچ سنٹر، قرآن اکیڈمی میں بطور ریسرچ ایسوسی ایٹ کے کام کر رہا ہوں۔ مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ بعض اہل علم نے اعتراض کیا ہے کہ مضمون میں حوالے نہیں تھے، جبکہ میں نے جو مضمون 'الشریعہ' میں شائع کروانے کے لیے بذریعہ ڈاک بھیجا تھا، اس میں تمام حوالہ جات باقاعدہ موجود تھے۔

۳۔ بعض اہل علم نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اہل سنت کے تصور 'شرائع من قبلنا' کے حوالے سے مضمون میں کوئی بحث نہیں آئی۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے جو مضمون 'الشریعہ' میں شائع ہونے کے لیے بھیجا تھا، اس میں تقریباً آٹھ صفحات پر مشتمل دو ابحاث، ایک تو ''غامدی صاحب کے تصور کتاب کا رد، شرعی دلائل (احادیث) کی روشنی میں'' اور دوسری بحث ''غامدی صاحب کے تصور کتاب اور اہل سنت کے تصور شرائع من قبلنا میں فرق'' کے بارے میں تھیں جن کو مدیر 'الشریعہ' نے شائع نہیں کیا۔ اگر مضمون کے شروع میں مدیر 'الشریعہ' کی طرف سے ایک پیراگراف میں اس بات کی وضاحت آ جاتی کہ ہم نے فلاں فلاں ابحاث کسی حکمت کے تحت مضمون سے نکال دی ہیں تو اچھا تھا۔

قارئین کی معلومات کے لیے اگر یہ خط 'الشریعہ' میں بھی شائع ہو جائے تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

حافظ محمد زبیر

ریسرچ ایسوسی ایٹ، قرآن اکیڈمی

36/K ماڈل ٹاؤن لاہور

(۲)

محترم المقام زاہد الراشدی صاحب

سلام خلوص!

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ طویل مدت سے 'الشریعہ'، 'شاداب' کے تبادلہ میں موصول ہو رہا ہے۔ دیگر اسلامی جرائد بھی موصول ہوتے ہیں، لیکن الشریعہ کا فکری رنگ ہی منفرد اور جداگانہ ہے۔ میں ہر شمارہ بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں اور کئی مرتبہ اس کے روشن خیالی اور شعور انسانیت پر مبنی فکر انگیز مضامین اپنے ہم خیال مسلم دوستوں کو بھی پڑھنے کے لیے دیتا ہوں۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے متعلق آپ کے مضامین نے بے حد متاثر کیا جو عصر حاضر کی سوچ کے غماز تھے۔ البتہ احمدیوں کے بارے میں مضامین خاصے ''دل آزار'' لگے۔ بہرکیف مسیحیت کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر اور انداز فکر قدرے فراخ دلانہ ہے۔ آج مناظرے کا دور نہیں رہا، لہٰذا ہمیں بین المذاہب یعنی انٹرفیتھ مکالمہ کو فروغ دینا چاہیے تاکہ مختلف مذاہب وادیان اور مسالک کے درمیان نہ صرف غلط فہمیوں اور کج بحثیوں کا خاتمہ ہو بلکہ باہمی رواداری، یگانگت، ہم آہنگی، محبت، اخوت اور برداشت کی ثقافت کو فروغ حاصل ہو۔

مئی ۲۰۰۶ء کے سرورق پر ''آرا و افکار'' کے حوالے سے عبارت اسی فکر کی نمائندہ اور ترجمان ہے۔ خاص طور پر یہ فقرے: ''صدیوں سے مذہبی طبقے کا دائرہ کار عقائد، عبادات اور نیک بننے کی مشق رہ گیا ہے۔ ان کے پاس انسانیت کی بہبود کے لیے سوچنے کی فرصت نہیں ہے۔'' اس فکر کی جتنی بھی ترویج واشاعت کی جائے اور اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے، وہ فی زمانہ کم ہوگی۔ رب کائنات آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔

اس شعر کے ساتھ اجازت دیں:

دین کوئی بھی اختیار کرے
آدمی آدمی سے پیار کرے

نوٹ: ایک ضروری بات رہ گئی۔ آرا و افکار کے مفکر اور آپ کے دست راست مولانا محمد عیسیٰ منصوری چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم لندن سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی جہاں ہم دونوں نے وکٹون ٹیلی وژن پر بین المذاہب مکالمہ اور لندن میں بم دھماکہ کی صورت حال پر گفتگو اور اظہار رائے کے لیے live پروگرام میں حصہ لیا جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ میں نے مسیحیوں اور مولانا نے مسلم حلقوں کی نمائندگی کی۔ یہ پروگرام تین مرتبہ پورے یورپ میں دکھایا گیا۔

والسلام

ڈاکٹر کنول فیروز
477 جہانزیب بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور

(۳)

محترم جناب عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ 'الشریعۃ' باقاعدگی سے ملتا ہے۔ اپریل کے مہینے میں آپ نے توہین رسالت کے نتیجے میں عالم اسلام میں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، اس پر نہایت سنجیدگی سے بحث کی ہے اور صورت حال کا نہایت عمدہ طریقے سے تجزیہ کیا ہے، لیکن امت مسلمہ کی داخلی صورت حال اور رویے کے ضمن میں جن امور کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے، ان پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

بدھ کے مجسموں کو مسمار کرنے کے واقعہ کو آپ نے سیاسی محرکات کے تحت داخل کیا ہے اور اس کو اخلاقیات کے منافی قرار دیا ہے، حالانکہ یہ واقعہ کوئی سیاسی پس منظر نہیں رکھتا۔ ہمارے فقہا اور علمائے کرام نے تصویر سازی اور مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا ہے۔ اکثریت کے نزدیک یہ حرمت علی الاطلاق ہے، لیکن جو تصویر سازی، مجسمہ سازی اور فنون لطیفہ کو اصلاً مباح قرار دیتے ہیں، ان کو بھی میرے خیال میں اس واقعہ پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ان کے نزدیک بھی اگر یہ فنون فواحش یا مشرکانہ افعال یا عقائد سے وابستہ ہوں تو پھر سد ذرائع کے طور پر انھیں حرام قرار دیا جا سکتا ہے۔ گوتم بدھ کو آج بھی کروڑوں لوگ پوجتے ہیں اور اس کے مجسمے کو عبادت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پس یہ اقدام مذہبی تعلیمات کی رو سے کیا گیا، سیاست سے اس کا تعلق جوڑنا صحیح نہیں ہے۔

دوسری اہم بات جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے، یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک مذہبی گروہ کے پیغمبر کے بارے میں تضحیک اور تمسخر پر مبنی لٹریچر شائع ہوتا ہے اور مذہبی جلسوں میں ان لوگوں کے بارے میں ناشائستہ زبان استعمال ہوتی ہے۔ یقیناً یہ ایک اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے، جس پر ہمیں اپنے رویے اور اخلاقی حالت کا جائزہ لینا چاہیے تاکہ افراط وتفریط سے بچا جائے اور صحیح بات کی طرف پیش رفت ممکن ہو، لیکن اگر کوئی مذہبی گروہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو گمراہ کر رہا ہو، اس کی سرگرمیاں مسلمانوں کے دین وایمان کے لیے خطرہ ہوں، اور خود ان کے پیغمبر کی کتابوں میں اسلامی شخصیات اور مسلمانوں کے حوالے سے تضحیک اور تمسخر پر مبنی مواد موجود ہو تو کیا ایسی باتوں کی نشان دہی کو اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کرنا بھی اسلامی تعلیمات کے منافی ہوگا؟

تیسری اہم بات توہین رسالت کو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک محدود رکھنے سے متعلق ہے۔ یقیناً مذہبی لیڈروں کو دیگر پیغمبروں کی توہین اور گستاخی کے رویے کا نوٹس لینا چاہیے اور اس حوالے سے بھی لوگوں کو متحرک کرنا چاہیے، کیونکہ تمام انبیا کا احترام لازمی ہے اور ان میں سے کسی ایک کی توہین بھی نبوت اور رسالت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ توہین رسالت کو کسی نے بھی رسول اللہ کی ذات گرامی تک محدود اور مخصوص نہیں کیا۔ مسلمانوں کے اس پر احتجاج نہ کرنے کو یہود ونصاریٰ کے ساتھ مذہبی مخاصمت کے رویے سے نہیں جوڑا جا سکتا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عبد الحمید

گاؤں سرڈھری (قلعہ)

ضلع چارسدہ

پروفیسر میاں انعام الرحمن☆

کسرِ کعبہ کی حضوری

پروفیسر منیر الحق کعبی بطور مصنف ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔نثر، تنقید، شاعری..... غرض اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف پر موصوف نے خامہ فرسائی کی ہے اور خوب کی ہے۔ان کا موجودہ حمد یہ کلام بعنوان''حریمِ حمد''اس وقت پیشِ نظر ہے۔کعبی جیسے شخص کا حمد کی طرف اس قدر جھکاؤ کہ پوری تصنیف منظر عام پر آ جائے، حیرت انگیز نہیں ہے بالخصوص اس تناظر میں کہ پچھلے چند سالوں سے ان کی طبع پڑی بدلتی دکھائی دیتی ہے۔ان کے سابقہ مجموعہ ہائے کلام''رگِ خواب''اور''قربِ گریزاں''کی غزلیات سے کسی بھی قاری پر آشکارا ہو جاتا ہے کہ انھوں نے غمِ دنیا کے حوادث کے مقابل غمِ یار کا خیمہ ڈال رکھا ہے اور حسنِ یار کی مالا جپنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔شاید ڈھلتی عمر میں بابِ وصال وا نہ ہونے سے احساسِ زیاں نے انھیں آ گھیرا ہے اور عاقبت سنوارنے کے پیشِ نظر ہمارے شاعر نے مجاز سے حقیقت تک کی مسافت طے کر لینے میں ہی عافیت جانی ہے۔حریمِ حمد کے اس شعر سے صورتِ حال کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے:

جسے اندر چھپا کر بھول بیٹھا
اسی کی جستجو کرنے لگا ہوں

''قربِ گریزاں''کا درج ذیل شعر بھی کعبی کے بدلتے رجحانِ طبع کی کی چغلی کھاتا ہے، اس کے بعد درج بالا شعر آخر کہنا ہی تھا۔

عذاب ٹھہرا ہر اک سے یہ سلسلہ رکھنا
خدا کے ساتھ بتوں سے معاملہ رکھنا

حریمِ حمد کے مذکورہ شعر کی معنوی اعتبار سے بہت سی پرتیں ہیں۔''اندر چھپا کر''انسانی نفسیات کے ایک عمومی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔یہ فطرتِ انسانی ہے کہ وہ اپنی سب سے پسندیدہ اور محبوب چیز کو بہت سنبھال کر، دھیان اور احتیاط سے ''محفوظ''کرنے کی کوشش کرتا ہے۔کعبی کے اس مصرعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سابقہ مجموعہ ہائے کلام میں غمِ یار کا بیان اصلی نہیں بلکہ مصنوعی اور بناوٹی ہے۔مخصوص طرزِ معاشرت یا خارجی جبر سے دب کر ہمارا شاعر''نیلم آنکھوں''کا اسیر رہا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ کعبی کی''اصل''نے حسنِ ازل کو احتیاطاً چھپا کر رکھ دیا اور...... بھلا دیا۔خود کعبی نے''حریمِ حمد''

☆ مکان نمبر 475، گلی شیخ غلام حسین، بازار بھابھڑیاں، گوجرانوالہ۔inaam1970@yahoo.com

میں اس کا ذکر یوں کیا ہے:

یہ نیلم ہیلم کچھ بھی نہیں اس حسن ازل کی بات کریں

اگر چہ ناقدین کہہ سکتے ہیں کہ ''انگور کھٹے ہیں'' لیکن راقم کی رائے میں کعمی ''مجاز'' کی بے ثباتی سے آشنا ہو گیا ہے اور اسی لمحے حسنِ مطلق بھی ''چھو کر حصارِ جسم کو جاں تک اتر گیا'' جس سے یہ شعر سامنے آیا:

رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے

خود اپنی آبرو کرنے لگا ہوں

جی ہاں! حسن ازل کی قربت سے ہی وہ خود شناسی جنم لیتی ہے جس سے انسان اپنی آبرو خود کرنے لگتا ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک اور لطیف نکتہ مضمر ہے کہ انسان تو خوامخواہ دوسروں کی شکایتیں کرتا پھرتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان خود اپنی آبرو نہیں کرتا۔

کعمی کے حمد یہ کلام میں بھی تغزل کا رنگ بہت گہرا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل ان کی محبوب ترین صنف ہے۔ ان کی غزل میں زبان کا رچاؤ اور اظہارِ بیان کا رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ ''حریم حمد'' میں تغزل کی آمیزش سے نہ صرف شعریت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اثر انگیزی بھی روٹین سے ہٹ کر ہے مثلاً:

جلا گئی ہے مرے دشت کی ہوا مجھ کو

نہ اور آتش ہجراں میں اب جلا مجھ کو

تو بار بار بلاتا رہا مجھے لیکن

بچھڑ کے یاد نہ عہدِ وفا رہا مجھ کو

اگر ان اشعار کی بابت ذکر نہ کیا جائے کہ یہ حمد کے اشعار ہیں تو شاید قاری کا دھیان بھی اس سمت نہ جائے۔ راقم کی رائے میں حمد یہ کلام میں ایسا اسلوب لائق تحسین ہے کیونکہ اس سے جیتے جاگتے زندہ خدا کا تصور ابھرتا ہے اور تجرد دم توڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ اکثر اوقات حمد یہ کلام میں خدا کی ذات کو ایسے پیش کیا جاتا ہے جیسے اس کا انسان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ راقم کو تجرد اور ماورائیت کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن صرف انھی پر فوکس کرنا، شاید بہتر نہیں ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ ''حریم حمد'' میں بھی بعض مقامات پر تجرد اور ماورائیت کے سے انداز میں حمد یہ کلام موجود ہے لیکن درج ذیل شعر میں کعمی نے تغزل کی لطافت اور حمد کے تقدس کو یکساں اور کمال خوبی سے نبھایا ہے:

تیر و نشتر ہیں ہمسفر آنکھیں

نام تیرا سپر سپر، مولا

اسی طرح یہ شعر بھی قابل غور ہے:

رت جگے اس کی ہی قسمت میں لکھے جاتے ہیں

جان کر اپنا جسے آہِ رسا دیتا ہے

احباب جانتے ہیں کہ غزل کہنے والے غم یار میں غم دنیا بھی شامل کر لیتے ہیں جس سے تغزل کا نیا آہنگ ابھرتا ہے۔

کعبی نے اس آہنگ کو بھی اپنے حمدیہ کلام میں جگہ دے کر معتبر بنا دیا ہے:

ہمارا وقت ہے گویا خلا میں آویزاں
مرے کریم! کسی بھی افق اترتا نہیں

''حریم حمد'' میں ایک دو مقامات پر تضاد سے بھی واسطہ پڑتا ہے مثلاً:

بشر ہو اور بشر سے وہ خوف خوردہ ہو
یقین مان وہ بندہ خدا کا بندہ نہیں

یہ میری ذات کا اک المیہ ہے کس سے کہوں
کہ آدمی ہوں مگر آدمی سے ڈرتا ہوں

''ذات کا المیہ'' کہہ کر ہمارے شاعر نے جہاں اپنی شخصیت کو گھمبیر بنا دیا ہے، وہیں مذکورہ تضاد سے گلوخلاصی پانے کی ناتمام کوشش کی ہے۔ یقیناً کعبی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس نے اظہار و بیان میں تصنع، بناوٹ اور لیپاپوتی سے کام نہیں لیا، لہٰذا اس کی شخصیت کے تضاد کھل کر سامنے آسکتے ہیں، اس لیے اس شعر سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے:

مرے خدا یہ مری شخصیت تو چاک ہوئی
مری انائے فگاراں کو اندمال ملے

''حریم حمد'' میں دعائیہ انداز بھی ملتا ہے جس میں خاصا اچھوتا پن ہے:

اپنی نورانیت سے بکھرا دے
سرکشی کی تنی گھٹا ہوں، خدا
اہلِ محفل سے بن نہ پائی کچھ
اور محفل سے آ گیا ہوں، خدا

کعبی کے اس حمدیہ کلام میں فکری اعتبار سے ایک بات کھٹکتی ہے کہ انھوں نے اشتراکی فلسفہ کو دور سے ہی سلام بھیج دیا ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں کے بیان سے پہلوتہی برتی ہے۔ شاید کعبی کی فکری نشوونما اس عہد میں ہوئی تھی جب چہار سو اشتراکیت کے خلاف محاذ گرم تھا اور وطن عزیز میں بھی سرمایہ دارانہ معیشت کا طوطی بولتا تھا .... اب بھی بولتا ہے اور زیادہ شدت سے بولتا ہے۔ گلوبلائزیشن کی صورت میں سرمایہ دارانہ نظام کی موجودہ توسیع انسانیت کش ہے۔ بہتر ہوتا، کعبی اس پر بھی سلام بھیج دیتے..... دور سے نہ سہی کم از کم قریب سے ہی سہی۔

''حریم حمد'' کے ابھی بہت سے پہلو ہیں جن پر بات ہوسکتی ہے۔ تاریخی واقعات کی خوبصورت منظر کشی سے لے کر اچھوتی تراکیب تک، سب کچھ اس میں جا بجا بکھرا ہوا ملتا ہے۔ ایک اختراع سے اس شعر میں واسطہ پڑتا ہے:

کچھ مجھ کو ہی دنیا کا چلن راس نہیں ہے
کچھ دوست مرے مجھ سے ہیں ساڑو، مرے مولا

لفظ ''ساڑو'' بڑی مہارت سے فٹ کیا گیا ہے شعر کی روانی متاثر ہوتی نظر نہیں آتی۔
کبھی جب مدح رسالت مآب ﷺ کی طرف آتے ہیں تو شعریت چھلک چھلک جاتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

کچھ اور عالمِ کیف و سرور ہوتا ہے
رسولِ پاک ﷺ کی یادوں میں جب اترتا ہوں
درود پڑھتا ہوں اور اس کے فیض سے کبھی
غبارِ نور میں ڈوبا ہوا ابھرتا ہوں

''رسولِ پاک ﷺ کی یادوں میں اترنا'' اور ''غبارِ نور میں ڈوبا ہوا ابھرنا'' .... کہنا ہی پڑتا ہے کہ، ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

آخر میں یہ بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ حمد یہ کلام، بندے اور خدا کا مکالمہ ہے .... خلوت میں مکالمہ۔ اس پر تبصرہ کرنا، شاید مخل ہونے کے مترادف ہے۔ راقم یقیناً مخل نہ ہوتا، لیکن یہ جناب کبھی کا حکم تھا جس کی تعمیل کے ضمن میں دخل در معقولات کی جسارت کر سکا۔

الشریعہ اکادمی کی سرگرمیاں

o پاکستان شریعت کونسل کے امیر حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی ۲۸/اپریل ۲۰۰۶ کو گوجرانوالہ تشریف لائے اور دیگر مصروفیات کے علاوہ کوروٹانہ میں الشریعہ اکادمی کے زیر تعمیر دینی تعلیمی مرکز میں ''دار القرآن'' کا سنگ بنیاد رکھا اور مغرب کی نماز کے بعد جہانگیر کالونی، کھوکھر کی گوجرانوالہ میں الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام جامع مسجد ابوذر غفاریؓ میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں جلسہ سے خطاب کیا۔

o حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نواسے اور جامعہ امام ولی اللہ مراد آباد (انڈیا) کے مہتمم مولانا مفتی محمد اسعد قاسم گزشتہ دنوں گوجرانوالہ تشریف لائے اور الشریعہ اکادمی میں فضلاے درس نظامی کی کلاس کو علوم قرآنی کے موضوع پر خصوصی لیکچر دینے کے علاوہ مولانا زاہد الراشدی، حافظ محمد عمار خان ناصر، پروفیسر میاں انعام الرحمٰن، مولانا حافظ محمد یوسف اور پروفیسر محمد اکرم ورک کے ساتھ ایک خصوصی نشست میں مختلف دینی وتعلیمی امور پر تبادلہ خیالات کیا۔ انھوں نے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ۱۹/مئی کو جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔

o ۷/مئی ۲۰۰۶ کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ایک خصوصی فکری نشست میں شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی کے سابق سربراہ ڈاکٹر حافظ محمود اختر نے ''حفاظت قرآن اور مستشرقین'' کے موضوع پر اہل علم اور اساتذہ سے خطاب کیا اور تحریک استشراق اور اس کے اہداف ومقاصد کا مختصر تعارف کروانے کے علاوہ قرآن مجید کے حوالے سے مستشرقین کے ہاں پائے جانے والے مختلف زاویہ ہائے نگاہ اور اعتراضات پر گفتگو کی۔ تقریب میں ڈاکٹر ممتاز احمد اعوان (کنٹرولر امتحانات گوجرانوالہ بورڈ) بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

o الشریعہ کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شش ماہی امتحان کی تعطیلات کے موقع پر دو ہفتے کے لیے برطانیہ روانہ ہو گئے ہیں۔ وہ ۲۸/مئی ۲۰۰۶ کو جامعۃ الہدیٰ شیفیلڈ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے علاوہ لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کی مرکزی کونسل کے اجلاس میں شریک ہوں گے اور لندن، مانچسٹر، گلاسگو، برمنگھم، نوٹنگھم، کراؤلی، برنلے اور دیگر مقامات میں مختلف دینی اجتماعات سے خطاب کے بعد ۹/جون کو جمعۃ المبارک کے موقع پر گوجرانوالہ واپس پہنچ جائیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔